تاریخ اسلام

ایک تحقیقی جائزہ

تحقیق و تالیف

ٹیم مستند تاریخ اسلامی

www.facebook.com/IslamicHistory2
www.islamichistory02.blogspot.com

مہید

اسلامی تاریخ کے موضوع پر مسلمانوں میں بہت سے شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں. انکی بڑی وجہ تاریخی کتابوں میں مکس قسم کی روایات ہیں جو اک لمحہ میں کسی کو ولی اور دوسرے لمحے میں اسے ظالم، چور، منافق اور خائن بنادیتی ہیں. ان روایات کی حقیقت کیا ہے؟ انکو روایت کر والے کون ہیں؟ انہوں نے ایسی روایات کیوں پیش کیں اور پھر یہ روایات کیسے تاریخ کی امہات کتابوں میں شامل ہو گئیں، انکی پہچان اور معیار ردو قبول کیا ہونا چاہیے ؟؟ یہ سوال تاریخ اسلامی سے دلچسپی رکھنے والے تقریباً ہر قاری کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ انہی سوالات کے جوابات میں فیس بک پیج پر تاریخ کے موضوع پر تحقیقی تحاریر کا اک سلسلہ شروع کیا گیا تھا. اس سے الحمدللہ کافی قارئین کو اپنی تاریخ کو سمجھنے اور کسی بھی تاریخی واقعہ کو پرکھنے میں مدد ملی. اب انہی کے مطالبہ پر اس سلسلہ کو کتابی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔

تاریخ - تعریف، فوائد اور ضرورت

تاریخ کا لغوی مفہوم:۔

لغت میں "تاریخ" وقت سے آگاہ کر (کسی چیز کے واقع ہو کا وقت بتا) کو کہتے ہیں۔(۱) اَرَّخْتُ الکتابَ: میں لکھنے کا وقت ظاہر کیا۔ علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری (المتوفی ۳۹۳ھ) فرماتے ہیں کہ "تاریخ اور توریخ" دونوں کے معنی وقت سے آگاہ کرنا ہیں؛ چناں چہ اس کے لیے "اَرَّخْتُ" بھی کہا جاتا ہے اور "وَرَّخْتُ" بھی۔(2)

تاریخ کا اصطلاحی مفہوم:۔

تاریخ کی اصطلاحی تعریف میں بڑی بڑی موشگافیاں کی گئی ہیں، یہاں دو کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

1. اصطلاح میں تاریخ اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ بادشاہوں، فاتحوں اور مشاہیر کے احوال، گزرے ہوئے زمانہ کے بڑے اور عظیم الشان واقعات وحوادث، زمانۂ گزشتہ کی معاشرت، تمدن اور اخلاق وغیرہ سے واقفیت حاصل کی جاسکے۔
2. بعض حضرات نے اس سے وہ سارے امور بھی ملحق کردیے جو بڑے واقعات وحوادث سے متعلق ہوں، جنگوں، امورِ سلطنت، تہذیب و تمدن، حکومتوں کے قیام، عروج وزوال، رفاہِ عامہ کے کاموں کی حکایت (وغیرہ) کو بھی تاریخ کہا گیا ہے۔

خلاصہ اور نتیجہ ان تمام اقوال کا یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ جو حالات وواقعات بقیدِ وقت لکھے جاتے ہیں، ان کو تاریخ کہتے ہیں۔(3)

تاریخ کی ضرورت وفوائد:۔

تاریخ سے گزشتہ اقوام کے عروج وزوال، تعمیر وتخریب کے احوال معلوم ہوتے ہیں، جس سے آئندہ نسلوں کے لیے عبرت کا سامان میسر آتا ہے، حوصلہ بلند ہوتا ہے، دانائی وبصیرت حاصل ہوتی ہے اور دل ودماغ میں تازگی ونشو نما کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، غرض تاریخ اس کائنات کا پس منظر بھی ہے اور پیش منظر بھی، اسی پر بس نہیں؛ بلکہ اس سے آئندہ کے لیے لائحۂ عمل طے کر میں بھی خوب مدد ملتی ہے۔(4)

حواشی وحوالہ جات:۔

1. القاموس المحيط للفيروز آبادی، فصل الهمزة:۳۱۷/۱، المحكم والمحيط الأعظم لابن سيدة ، فصل الخاء واللام والهمزه: ۲۳۸/۵، دار الكتب العلمية، المعجم الوسيط باب الهمزة:۱۳/۱، دار النشر، تاج العروس، أرخ: ۲۲۵/۷، دار الهداية، لسان العرب، أرخ:۴/۳، دار صادر۔
2. الصحاح : ۴۴۰/۱ ، مختار الصحاح ، باب الألف :۱۳/۱، مكتبة لبنان ناشرون۔
3. الشماريخ في علم التاريخ للسيوطي: ۱۰/۱۔۱۴، الدار السلفية كويت ، تاريخ ابن خلدون : ۳/۱، ۹،۳۵، تاريخ الإسلام للذهبي: ۱۲/۱، دار الكتاب العربي، تاريخ الطبري: ۱۲/۱، دار الكتب العلمية۔
4. الكامل في التاريخ : ۹/۱، دار الكتب العلمية ، الشماريخ في علم التاريخ للسيوطي: ۱۴/۱

تاریخ کی اقسام

مختلف اعتبارات سے تاریخ کی بہت سی قسمیں ہو سکتی ہیں، مثلاً باعتبار کمیت دو قسمیں عام اور خاص ہو سکتی ہیں،

عام تاریخ وہ ہے جس میں ساری دنیا کے آدمیوں کا حال بیان کیا جائے. **خاص** وہ جس میں کسی ایک قوم یا ایک ملک یا ایک خاندان کی سلطنت کا حال بیان کیا جائے، باعتبارِ کیفیت تاریخ کی دو قسمیں روایتی اور درایتی ہیں،

روایتی تاریخ وہ ہوتی ہے جس میں راوی کا بیان اس کے مشاہد کی بنا پر درج کیا گیا ہو اور اُس واقع کے وقوع پذیر ہونے کے متعلق قابلِ قبول اور تسکین بخش روایتیں مورخ کو حاصل ہو گئی ہوں یا مورخ نے براہ راست اس واقعہ کو خود مشاہدہ کیا ہو، ایسی تاریخیں سب سے زیادہ مفید اور قابل قدر سمجھی جاتی ہیں اور اُن میں قیاس کے گھوڑے دوڑانے اور موہوم باتوں کو حقیقت کا جامہ پہنانے کی کوشش نہیں کرنی پڑتی؛ بلکہ ان تاریخوں سے فہم و عقل اگر غلطی کرے تو اس کی اصلاح ہو جاتی ہے

درایتی تاریخ اُس تاریخ کو کہتے ہیں جو محض آثارِ قدیمہ و آثارِ منقولہ اور عقلی ڈھکوسلوں کے ذریعہ ترتیب دی گئی ہو اور ہم عہد مورخ یا ہم عہد راوی کا بیان اس کے متعلق مطلق دستیاب نہ ہو سکتا ہو جیسے کہ قدیم مصر، قدیم عراق، قدیم ایران کی تاریخیں آج کل لکھی گئی ہیں۔

اپنی تاریخ سے محبت کون رکھتے ہیں ؟؟

تاریخ میں چونکہ اچھے آدمیوں کی خوبیاں اور بُرے لوگوں کی بُرائیاں لکھی جاتی ہیں لہذا کسی رذیل یا کمینہ خاندان والے کو علم تاریخ سے بہت ہی کم محبت ہو سکتی ہے. شریف قوموں کو اپنے آباء واجداد کے کارہائے نمایاں یاد ہوتے ہیں جن کی پیروی کو وہ اپنی شرافت قائم رکھنے کے لئے ضروری سمجھتے ہیں، رذیل قومیں امتداد زمانہ کے سبب اپنے بزرگوں کے بزرگ کاموں کو بھی بھول جاتی ہیں، کسی خاندان یا قوم کو جس کے باپ دادا نے خدا پرستی، جوانمردی، علم وہنر، جاہ وحشمت وغیرہ میں خصوصی امتیاز حاصل کیا ہو اور وہ اس کو بالکل فراموش نہ کر چکے ہوں تو ان کو بزرگوں کے بڑے بڑے کارنامے بار بار یاد دلا کر عزم وہمت اور غیرت وحمیت اُن میں پیدا کر سکتے ہیں، مگر رذیل قوموں کے اندر یہ کام نہیں ہو سکتا، یہی سبب ہے کہ علم تاریخ کا شوق رکھنے والے اکثر شریف القوم، عالی نسب، بزرگ زادے اور نیک آدمی ہوتے ہیں، کوئی کمینہ خاندان کا آدمی یا خدائے تعالیٰ کا منکر یعنی دہریہ یا کوئی بزدلی میں شہرت رکھنے والا دنیا میں اعلیٰ درجہ کا مورخ اور تاریخ کا امام نہیں گذرا۔

(تاریخ اسلام از اکبر نجیب آبادی صفحہ 25، 26)

تاریخ کا مطالعہ کیسے ؟؟

تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کے سامنے کون سے امور اور اہداف ہونے چاہئیں یہ بات تاریخ کے مطالعہ سے زیادہ اہم ہے۔ ہاں یہ بات ہے اُس قوم کیلئے جو تاریخ پڑھتی بھی ہو اور اُس سے سبق بھی لیتی ہو. تاریخ کو پڑھنا اور اُس کے نتائج اپنے زمانے میں محسوس کرنا اور مستقبل کے لئے لائحہ عمل تیار کرنا، زندہ قوموں کیلئے یہ تینوں کڑیاں یکساں اہمیت رکھتی ہیں۔

ہمارے ہاں جن دانش وروں کو علم سے زیادہ شہرت عزیز ہوتی ہے، اُن کے ہاں اسکالر اور ماڈرنسٹ کہلانے کا معیار یہ ہے کہ اپنے ماضی پر کیچڑ اچھالیں، تاریخ ساز شخصیات کی تنقیص کریں، اسلام کی تاریخ سے لغزشیں ہی ڈھونڈ لائیں، تب ہی وہ سمجھتے ہیں کہ دانش ور کہلائیں گے۔کوئی مانے یا نہ مانے انسان کا حال اُس کے ماضی سے جڑا ہوتا ہے. ماضی کی شخصیات تو ضرور مرجاتی ہیں لیکن ان کا تذکرہ اور چھوڑے ہوئے اثرات نہیں مرتے، معاشرہ ان اثرات کو لیے ہوئے آگے بڑھتا رہتا ہے جیسے جوانی بچپنے سے جڑی ہوتی ہے اور عمر رسیدہ اپنی جوانی کو نہیں بھولتا۔

قرآن مجید بھی تاریخ بشری کو بہت اہمیت دیتا ہے۔تلاوت کرنے والا اگر صاحب بصیرت ہو تو قرآن مجید اُس کے سامنے قوموں کی کامیابی اور ناکامی کے اصول رکھتا ہے۔اپنے مخاطبین کے مسائل اُن کی تاریخ سے جوڑتا ہے۔اُن کے سامنے اخلاقی اور عمرانی اصول رکھتا ہے۔ترقی اور زوال کے اصول بتاتا ہے۔قوموں کی سرفرازی اور ناکامی کے اسباب ابن خلدون نے بھی بتائے ہیں۔ہمیں تاریخ کا مطالعہ نئے زاویے سے کرنا ہے، جس کا مقصد ناک بھوں چڑھانا نہ ہو، علامہ محمود محمد شاکر کے بقول بے جان روح میں جان ڈالنا اور اتھاہ گہرائی سے نکل کر اپنے زمانے کو سمجھنا، ماضی کو حال سے جوڑنا، وقائع سے حقائق نکالنا، غیر جانبداری برتنا، مؤرخین سے جہاں سہواً یا عمداً لغزش ہوئی ہے اُس کی حقائق سے اصلاح کرنا۔

ہمارے تاریخ کے مطالعے کی دو جہتیں ہیں۔ایک ہماری سیاسی تاریخ ہے اور دوسری ثقافتی اور علمی۔سیاسی تاریخ میں اُتار چڑھاؤ معمول کی بات ہے البتہ یہ اعزاز صرف مسلمانوں کو حاصل ہے کہ ان کی علمی ترقی مغرب کی ترقی کی طرح حکومت کی مرہون منت نہیں ہے۔یہ بات ہماری تاریخ میں عام ہے کہ سیاسی حالات ابتر ہیں یا حاکم وقت ظالم ہے مگر دوسری طرف علمی میدان روز بروز ترقی پر ہے۔

مطالعے کے چند آداب:-

تاریخ کا مطالعے کے بعد کسی ایسے شخص کو بُرا کہنا یا گالیاں دینا جو اس دنیا کے تماشاگاہ سے رخصت ہوچکا ہے جوانمردی نہیں، ہاں کسی گذرے ہوئے سے محبت کا اظہار اوراُس کے لئے دعائے خیر کرنا اُس کی برائیوں کی نیک تاویل کرنا کوئی عیب کی بات نہیں ہے،تاریخی کتابوں کا مطالعہ کرنے والا جس قدر بے جا تعصب میں مبتلا ہوگا اُسی قدر اس کو تاریخی مطالعہ کا نفع کم ہوگا.

(مطالعہ تاریخ چند مبادیات، ڈاکٹر محمد عبدہ،! ترجمہ: محمد زکریا)

مارخ کا آغاز:۔

رومیوں اور یونانیوں کے دور بالخصوص سکندر اعظم کی فتوحات سے تاریخ کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جس نے دنیا کے اکثر ملکوں کے حالات کو اس طرح ہمارے سامنے پیش کیا کہ سلسلہ کو درمیان سے منقطع ہونے کی بہت کم نوبت آتی ہے اورعام طور پر یہیں سے تاریخی زمانہ کی ابتداء سمجھی جاتی ہے،یونان، مصر اورایران کے حالات مطالعہ کرنے سے جس طرح تاریخی مطالعہ کے شوقین کوخوشی حاصل ہوتی ہے،اسی طرح ہندیوں پر اُس کو طیش وغضب آتا ہے کہ اس تاریخی زمانہ میں بھی ہندوستان پر تاریکی چھائی ہوئی نظر آتی ہے،یہاں والوں کی اس بے پروائی نے مورخین عالم کو ہمیشہ خون بہ جگر بنایا کہ انہوں نے فرضی باتوں کو ہمیشہ سچ کا قالب پہنایا اورسچ کو کبھی سیدھی طرح نہ سنایا، اس آباد وسر سبز ملک ہندوستان کے مقابلہ میں ایک دوسرا ریگستانی ملک عرب ہے جو روایات کی صحت حافظہ کی قوت،سلسلہ انساب کو محفوظ رکھنے اور واقعات کو اُن کی من و عن حالت بیان کرنے کے لئے ہندوستان کی ضد ہے اوراسی لئے وہ جاہلیت میں بھی تاریخ سرمایہ میں ایک قیمتی چیز شمار ہوتے ہیں۔

(تاریخ اسلام از مولانا نجیب اکبر آبادی)

مارخ کی حقیقی ابتداء

قرآن کریم نازل ہوتا ہے،عرب تمام دنیا پر چھا جاتا ہے،سارے تمدن عربی تمدن کے آگے ھباء منثورا ثابت ہوتے ہیں اور حقیقی معنی میں تاریخ کی ابتداء ہوتی ہے. حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک سے باقاعہ آغاز ہوتا ہے. صحابہ رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرایا وغزوات کے حالات نہ صرف اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے تھے ؛بلکہ اپنی اولاد کو بھی انھیں یاد کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے؛ لیکن باقاعدہ تمام اخبار و وقائع کو بصورتِ تاریخ مدون کرنے کا کام دوسری صدی ہجری میں بنو عباس کے عہدِ حکومت میں شروع ہوا، ابتدا میں واقعات کو بیان کرنے کے لیے سند کا اہتمام کیا گیا؛ یہاں تک کہ اشعار بھی سند کے ساتھ بیان کیے جاتے تھے؛ چناں چہ تاریخِ طبری اور کتاب الأغانی اس کا مظہر ہیں؛ لیکن یہ واضح رہے عام اخبار و قائع اور اشعار کے راویوں کی بابت بحث و تمحیص اور تحقیق کے باب میں وہ اہتمام اور شدت نہیں برتی گئی جو روایاتِ حدیث کے متعلق بحث و تمحیص اور تحقیق کے باب میں برتی گئی۔

احادیث کی روایت کے اہتمام اورفن اسماء الرجال وغیرہ کے مرتب ومدون ہونے کے عظیم الشان کام اور اہم ترین انتظام سے قطع نظر کی جائے تب بھی مسلمانوں میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں مورخ ایسے ملیں گے جن میں سے ہر ایک نے فن تاریخ کی تدوین میں وہ وہ کارہائے نمایاں کئے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے،تمدن کی کوئی شاخ اور معاشرت کا کوئی پہلو ایسا نہ ملے گا جس پر مسلمانوں تاریخیں مرتب نہ کی ہوں، تاریخ کی جان اورروح رواں روایت کی صحت ہے اور اس کو مسلمانوں نے اس درجہ ملحوظ رکھا ہے کہ آج بھی مسلمانوں کے سوا کسی دوسری قوم کو بطورِ مثال پیش نہیں کیا جاسکتا ،دوسری اقوام اوردوسرے ممالک کی تاریخیں مرتب کرنے میں بھی مسلمانوں کی طرف سے نہایت زبردست صلاحیتیں صرف کی گئی ہیں.

اسلامی مارخ کا طرہ امیاز:۔

دنیا کی تمام قوموں اورتمام مذہبوں میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب اور مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جس کی تاریخ شروع سے لے کر اخیر تک بتمام مکمل حالت میں محفوظ وموجود ہے ،مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر آج تک مسلمانوں پر گذرنے حالات واقعات کے قلم بند کرنے اور بذریعہ تحریر محفوظ کرنے میں مطلق کوتاہی اورغفلت سے کام نہیں لیا،مسلمانوں کو بجاطور پر فخر ہے کہ وہ اسلام کی مکمل تاریخ ہم عہد مورخین اورمستند ثقہ راویوں کے بیانات میں تواتر کا درجہ بھی دکھا سکتے ہیں.غرض کہ صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جو اپنی مستند اورمکمل تاریخ رکھتی ہے اور دنیا کی کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں جو اس خصوصیت میں مسلمانوں کی شریک بن سکے۔

مغرب کی تاریخ اوراسلامی تاریخ کی مبادیات میں بہت بڑا فرق یہی ہے۔مغرب کا اصول حیات افادیت ہے جبکہ اسلام کی تاریخ ایمانیات سے مربوط ہے .مغربی وقائع نگار اور مؤرخ کے نزدیک اخلاقی معیار اور ہیں اور ہمارے ہاں اور۔وہ کسی شخصیت کا تذکرہ محض اُس کے کارناموں کو دیکھ کر کرتے ہیں۔سوسائٹی کو جو فائدہ اُس سے ہوا وہی اُن کیلئے اہمیت رکھتا ہے۔اس لئے ان کی تاریخ پڑھتے ہوئے ہمیں کامیاب شخصیات سے واسطہ پڑتا ہے گویا مغرب کی نامور شخصیات معصوم ہوتی ہیں۔

مسلم مؤرخ کے نزدیک اخلاقی اور ایمانی پیمانہ سب سے اہم ہوتا ہے اس لئے اُن کے تذکروں میں اخلاقی بے ضابطگی سے وہ صرف نظر نہیں کرتے۔ہماری وسعت نظری اور دیانت داری ہی جدید مؤرخ کے نزدیک ہمارا عیب ہے۔جدید مؤرخ کے نزدیک اپنے خوبیاں ہی بیان کرتے چلے جانا تاریخ کا صحیح مطالعہ ہے۔

فن تاریخ کو علم کے درجہ تک پہنچانے کا کام مسلمانوں ہی کی نظر التفات کامرہون منت ہے ۔ اصولِ تاریخ کے بانی ابن خلدون کا نام دنیا میں ہمیشہ مورخین سے خراجِ تکریم وصول کرتا رہے گا۔جب سے مسلمانوں پر تنزل وادبار کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں اور مسلمان مورخین کی کوششوں میں وہ پہلی سی مستعدی اور تیز رفتاری کم ہوگئی ہے،اُن کے شاگرد یعنی یورپی مورخین اس کمی کو ایک حد تک پورا کرنے میں مصروف ہیں۔

.....

اسلامی تاریخ میں گمراہ کن روایات کی ملاوٹ

اسلامی تاریخ پر لکھی گئی کوئی کتاب جب کسی مسلماں قاری کے مطالعہ میں آتی ہے تو وہ قروں اولی اور صحابہ کی زندگی کے واقعات کو اسی حسن ظن اور عقیدت کے ساتھ پڑھنا شروع کرتا ہے جو قرآں و حدیث کے دریعے اس کے دہن میں بیٹھی ہوتی ہے، لیکن آہستہ آہستہ جب تاریخ اپنا رنگ دکھانا شروع کرتی ہے اور وہ صحابہ کے کردار کو مجروح کرنے والی روایات پڑھتا ہے تو پریشاں ہو جاتا کہ یہ کیسے خیر القروں کا مذکرہ ہے؟ قرآں نے تو ہمیں بتایا ہے کہ تم نے ایماں لایا ہے تو اس طرح ایماں لاو جس طرح یہ صحابہ لائے ب تمہارا ایماں قابل قبول ہوگا، اور تاریخ انہیں بے ایماں ثابت کررہی ہے۔۔ قرآں وحدیث انکی صداقت، شجاعت، احلاص، سچاہی، ہدایت یافتہ ہونے کے سرٹیفکیٹ دیتے نظر آتے ہیں (اولئک ھم الراشدوں، مفلحوں، صدیقوں وغیرہ) اور تاریخ (نعوذ باللہ) انہیں چور، داکو، مکار، منافق اور بداحلاق ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ یہ باتیں اسکے لیے بہت عجیب اور اسکی توقعات کے بالکل برعکس ہوتی ہیں۔ سایداس میں قصور کتاب کے فرسٹ پیج پر تاریخ کے ساتھ استعمال کیے گئے لفظ 'اسلام' کا بھی ہوتا ہے جو قاری کو شروع میں ہی اعتماد دلا دیتا ہے اور وہ اسے ایک اسلامی کتاب کے جذبے سے پڑھنا شروع کرتا ہے لیکن پھر دروغ گو راویوں کی ملاوٹ، واقعہ نگاری اور جذباب نگاری اسے کنفیوز کردیتی ہے.

تاریخ میں اکابرین اسلام کے متعلق متعصب اور گمراہ لوگوں کی روایات کی آمیزش اسلامی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے، اسی کی بنیاد پر بعد میں کئی قسم کے فرقے بھی وجود میں آئے۔ یہ ملاوٹ کیسے ہوئی اس میں بڑا کردار تاریخی واقعات کو نقل کرنے والے راویوں کے نظریات اور مذہبی رجحانات نے ان واقعات کو بیان کرنے اور اس کے لیے اختیار کی جانے والی تعبیر میں مرکزی کردار ادا کیا، خصوصاً جب انھیں روایت بالمعنی کی عام اجازت بھی حاصل تھی؛ چناں چہ بہت سارے گمراہ عقائد و افکار کے حامل راویوں نے قرونِ ثلاثہ سے متعلق واقعات کو اپنے مذہبی رجحانات و نظریاتی افکار کے تحت حقائق کو نظر انداز کرکے اس طرح بیان کیا کہ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین کے بارے میں بہت سارے مطاعن پید ہوتے چلے گئے۔

تاریخ نویسی میں دروغ گوئی کے بنیادی اسباب:۔

اگر آپ قرون ثلاثہ کی تاریخ کا باریک بینی سے جائزہ لیں گے تو تدوین کے اس زمانہ میں جھوٹ کے ظاہر ہونے کے اسباب و اہداف میں تداخل پائیں گے، بسا اوقات ایک ہی واقعہ میں سبب اور ہدف دو نوں پائے جائیں گے، اگر آپ نفس واقعہ کی طرف دیکھیں گے تو آپ کو اس کا سبب نظر آئے گا؛ لیکن اسی واقعہ پر نتیجہ کے اعتبار سے غور کیا جائے تو اس کی ایک غرض بھی سامنے آئے گی۔غرض دروغ گوئی کے بعض ایسے واضح ، جن کی وجہ سے قرون ثلاثہ کے دوران عام طور سے اور تدوین تاریخ کے وقت خاص طور سے دروغ گوئی نے جڑ پکڑ لی تھی۔

ویسے تو دروغ گوئی کے اسباب کثیر تعداد میں ہیں ، ہم یہاں صرف چنداہم اور بنیادی اسباب کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔

۱- سیاسی اختلافات ۲- فکری اور مذہبی گمراہی و بے اعتدالی۔ ۳- باطنی امراض (کفر و نفاق اور زندقہ)

سیاسی اختلافات:۔

بنیادی طور پر سیاسی اختلافات ہی وہ اہم سبب ہے جس نے امتِ مسلمہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے باہم مقابل فرقوں میں بانٹ کر ایک دوسرے کے خون کا پیا سا بنادیا، سیاسی اختلافات کی ابتدا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے آخری ایام میں ہوئی جس کا سلسلہ بعد کے زمانوں میں مختلف صورت میں جاری رہا۔

فکری اور مذہبی گمراہی:۔

فکری اور مذہبی گمراہی نے اسی سیاسی فتنہ کے بطن سے جنم لیا، اس اندھے سیاسی فتنہ نے فکری اور مذہبی انحراف کو مزید گہرا کر کے نہ صرف اسے بنیاد فراہم کیا؛ بلکہ اس کا دفاع کر کے اسے ایک مقدس ، شرعی و مذہبی رنگ دے دیا ، جیسا کہ صراطِ مستقیم سے انحراف کرنے والے، اسلام کی طرف منسوب بہت سارے گمراہ فرقے خوارج و روافض وغیرہ کا حال یہی ہے کہ دونوں نے سیاسی فتنہ کے بطن سے جنم لے کر اسی کی گود میں پرورش پائی اور اس کی تائید سے صراط مستقیم سے منحرف ان فرقوں نے ایک مقدس مذہبی رنگ کا لبادہ اوڑھ لیا ، جن کی قداست کے پسِ پردہ امت مسلمہ کو گزشتہ تیرہ صدیوں سے لہو لہان کیا جارہا ہے۔

امراض باطنی:۔

امراض باطنی جیسا کہ کفر ، نفاق،زندقہ، حسد، کینہ ، دنیا کی محبت و حرص وغیرہ یہ وہ اسباب ہیں جنہوں نے بہت سارے لوگوں کو دروغ گوئی، اس میں مہارت و امتیاز حاصل کرنے پر ابھارا اور مجبور کیا، پھر اس کے برے اور زہریلے اثرات میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب ان امراض باطنی اور سیاسی و مذہبی اختلافات میں امتزاج ہوا۔

یہ وہ مرکزی اور گہرے و بنیادی اسباب تھے جنہوں نے ان دروغ گو راویوں کے لیے زمین ہموار کی اور فضاو ماحول کو سازگار بنایا جس کی وجہ سے وہ نہ صرف جھوٹ و دروغ گوئی کی طرف متوجہ ہوئے؛ بلکہ اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی سعی نامسعود کی؛ تاکہ اپنے زعمِ باطل کے مطابق اس دروغ گوئی کے سہارے اپنے مذہب کی خدمت، مصالح کے حصول اور شہوات کی تکمیل کرسکیں۔

چند مزید اسباب :

1. مخصوص فکری و مذہبی فرقہ کی تائید و نصرت:۔

دروغ گوئی و کذب کے ظاہر ہونے کے اسباب میں ایک سبب صراط مستقیم سے منحرف رہنے والے مخصوص فکری و مذہبی فرقہ کی تائید و نصرت بھی ہے ، علامہ ذھبی رحمہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ دروغ گواور کذّاب احمد بن عبداللہ جو یباری فرقہ کرامیہ کی نصرت و دفاع کی خاطر محمد بن کرام کے لیے احادیث گھڑا کرتا تھا اور محمد بن کرام انھیں اپنی کتابوں میں ذکر کرتا تھا۔..اس طرح دروغ گو و کذّاب قاضی محمد بن عثمان نصیبی روافض کی تائید و نصرت کی خاطر احادیث گھڑاکرتا تھا، اور ابو جارود بن منذر کوفی مثالبِ صحابہ میں احادیث وضع کیا کرتا تھا، عبدالرحمن بن خراشی شیعی کا بھی یہی وطیرہ تھا، اس نے حضرات شیخین رضی اللہ عنہم کے مزعومہ مثالب میں دو رسالے تحریر کرکے روافض کے ایک بڑے پیشوا کی خدمت میں پیش کیا تو اس نے اسے دو ہزار درھم انعام میں دیے۔

(میزان الاعتدال :۱/۲۴۵،دار لکتب العلمیہ ، الضعفاء لابن الجوزاي: ۳/۸۴، ۴/۳۶۵،دار لکتب العلمیة، لسان المیزان : ۳/۴۴۴)

! غور فرمائیں کہ مذکورہ بالا تینوں افراد کا ہدف و مقصد وضعِ حدیث سے صرف اپنے مخصوص فرقہ کے فکری و اعتقادی افکار کی تائید کے علاوہ کچھ نہیں، یہ لوگ انبیاء کرام کے بعد بالاتفاق خیر البشر و افضل البشر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف زبان درازی اور دلی کینہ کے اظہار کی غرض سے دروغ گوئی کیا کرتے تھے، روافض نے اہل بیت و حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تین ہزارکے قریب جعلی احادیث وضع کی ہیں۔

(میزان الاعتدال:۲/۱۷۱)

2. ترغیب و ترہیب:۔

دروغ گوئی کے اہداف میں ایک ہدف لوگوں کو دین کی ترغیب دینا اور ان کے دلوں کو نرم کرنا اور اپنے مزعومہ نظریہ کے مطابق لوگوں کو اجر کی امید دلانا اور گناہ سے روکنے کے لیے ترہیب بھی تھا، جیسا کہ بعض جہل گزیدہ نام نہاد صوفیوں نے اس قبیح فعل کا ارتکاب کیا۔

3.مادی و معاشی فوائد کا حصول:۔

دروغ گوئی کے مرکزی اہداف و اسباب میں ایک بڑا اور بنیادی سبب جاہل عوام کو اپنی طرف مائل کر کے ان سے مادی و معاشی فوائد حاصل کر کے اپنی خواہشات کو پورا کرنا بھی تھا، یہ طرزِ عمل مخصوص گمراہ فرقوں کے علاوہ قصہ گو اور واعظ قسم کے لوگوں نے بھی اختیار کیا تھا، یہ لوگوں کو جھوٹی روایات ، عجیب و غریب اور محیر العقول قسم کی باتیں گھڑ کر سنایا کرتے؛ تاکہ لوگ ان سے متأثر ہو کر ان کی مادی و معاشی ضروریات کی تکمیل میں معاونت کریں۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ علیہ نے میں لکھا ہے کہ ابراہیم بن فضل اصفہانی

(المتوفی ۵۳۰ھ)اصفہان کے بازار میں کھڑے ہو کر اسی وقت اپنی طرف سے احادیث گھڑ کر لوگوں کو سنایا کرتا تھا اور ان روایاتِ کاذبہ کے ساتھ صحیح روایات کی اسانید کو جوڑا کرتا تھا۔ (لسان المیزان :۱۳/۱، مؤسسة الأعلمي بيروت)

4. شخصی یا گروہی مفادات:۔

ایک سبب اپنے شخصی یا گروہی مفاد کے لیے بعض برگزیداور بڑے لوگوں کی مدح یا مذمت میں احادیث وضع کرنا بھی تھا، علامہ ذہبی نے امام مازری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ نعیم بن حماد امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ کے مثالب میں جھوٹی روایات و ضع کیا کرتا تھا، علامہ ذہبی ہی نے لکھا ہے کہ احمد بن عبداللہ جو یباری نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ کی مدح میں ایک حدیث وضع کی تھی۔

(میزان الاعتدال :۴/۷ ، میزان الاعتدال :۲۴۵۱)

ان تمام اسباب و اہداف میں غور و فکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کذب و دروغ گوئی کے پھلنے اور پھولنے کی بنیاد تو ان دروغ گوراویوں کے باطنی امراض کے سبب وجود پذیر ہوئی ؛ لیکن سیاسی ، گروہی اور مادی و معاشی عوامل نے اس کی گہرائی و نشاط میں اضافہ کر کے اسے مزید سہ آتشہ بنایا۔

عہد اسلامی کی تاریخ کا اہم ترین مصدر۔ تاریخ طبری

جن حقائق کا ہم نے گزشتہ تحاریر میں تذکرہ کیا ، ان کا ہماری اسلامی تاریخ سے کتنا تعلق ہے اور اس کے کیا برے اثرات مرتب ہوئے ،ان کا ایک سر سری جائزہ لینے کی غرض سے ہم نے کتبِ تاریخ میں سے علامہ ابن جریر بن یزید طبری (المتوفی: ۳۱۰ھ) کی مشہور و معروف تصنیف "تاریخ الأمم والملوک المعروف بتاریخ الطبری" کا بطور نمونہ کے انتخاب کیا ہے، تاریخِ طبر ی ہماری عہدِ اسلامی کی تاریخ کا اہم مصدر ہو نے کے علاوہ قرونِ ثلاثہ کے حوالہ سے سب سے اہم ، کثیر المعلومات اور مستند کہی جانے والی کتاب ہے

اس کتاب کا نام "تاریخ الرسل والملوک " یا "تاریخ الأمم و الملوک"ہے؛ االبتہ "تاریخ طبری" کے نام سے عوام و خواص میں مشہور ہے۔علامہ طبری کی یہ تصنیف عربی تصانیف میں مکمل اور جامع تصنیف شمار کی جاتی ہے، یہ کتاب ان سے پہلے کے مؤرخین یعقوبی ، بلاذری ، واقدی، ابن سعد وغیرہ کے مقابلہ میں اکمل اور ان کے بعد کے مؤرخین ، مسعودی، ابن مسکویہ ، ابن اثیر اور ابن خلدون وغیرہ کے لیے ایک رہنما تصنیف بنی۔معجم الادباء میں یا قوت حموی نے لکھا ہے کہ ابن جریر نے اپنی اس تالیف میں ۳۰۲ ھ کے آخر تک کے واقعات کو بیان کیا اور بروز بدھ ۲۷ ربیع الاول ۳۰۳ھ میں اس کی تکمیل کی۔

(معجم الأدباء:۵۱۶/۶،مؤسسة المعارف)

ابن جریر طبری ۔ تعارف

نام: محمد

ولدیت: جریر

دادا کا نام: یزید

کنیت: ابو جعفر

پیدائش طبرستان میں ہوئی،اس کی نسبت سے "طبری" کہلاتے ہیں۔

سنہ ولادت میں دو قول ہیں:(۱)۲۲۴ھ کے اخر میں، (۲)۲۲۵ھ کے اول میں۔

خود اپنے ابتدائی حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے سات سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ یاد کرلیا،آٹھ سال کی عمر میں لوگوں کو نمازیں پڑھانا شروع کردیں اور نوسال کی عمر میں حدیث لکھنا شروع کردی تھی.

ابن جریر طبری نے علوم و فنون کی تکمیل کے لیے مختلف علماء اورعلاقوں کی طرف اسفار کیے۔عراق میں ابو مقاتل سے فقہ پڑھی، احمدبن حماد دولابی سے کتاب "المبتدا" لکھی ،

مغازی محمد بن اسحاق بواسطہ سلمہ بن فضل حاصل کی اور اسی پر اپنی تاریخ کی بنیاد رکھی۔کوفہ میں ھناد بن سری اور موسی بن اسماعیل سے حدیث لکھی ، سلیمان بن خلاد طلحی سے قرآت کا علم حاصل کیا پھر وہاں سے بغداد لوٹ آئے، احمد بن یوسف تغلبی کی صحبت میں رہے اور اس کے بعد فقہِ شافعی کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوئے اور اسی کو اپنامسلک ٹھہرا کر کئی سال تک اس کے مطابق فتویٰ دیتے رہے، بیروت میں عباس بن ولید بیروتی سے شامیوں کی روایت میں قرآت و تلاوت مکمل کی۔یوں آپ نے حدیث ، تفسیر ، قرآت ، فقہ ،تاریخ، شعر و شاعری اور تمام متداول علوم و فنون میں مہارت حاصل کر لی . پھر مختلف عنوانات پر ۲۶ کے قریب کتابیں تصنیف کیں ، ان میں تفسیر طبری کے علاوہ تاریخ طبری بہت زیادہ مشہور و معروف ہے۔

ابن جریر طبری کا مذہب - ایک غلط فہمی کا ازالہ:۔

تاریخ طبری کے مصنف" ابن جریر طبری "کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سنی شافعی المسلک تھے،طبقاتِ شافعیہ اور دیگر رجال کی کتابوں میں یہی مذکور ہے بعد میں وہ درجۂ اجتہاد پر فائز ہوگئے تھے اور فقہائے مجتہدین کی طرح ان کا بھی مستقل مکتبِ فقہ وجود میں آگیا تھا جو ایک عرصہ تک قائم رہا۔(۱) اس موقع پر یہ یاد رہے کہ اسی نام وولدیت سے ایک اور شخص بھی گزرا ہے جو رافضی مذہب سے تھا؛چناں چہ علمائے رجال نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم طبری رافضی تھا،اس کی بہت ساری تصانیف بھی ہیں،ان میں سے ایک "کتاب الرواۃ عن أہل البیت" بھی ہے،حافظ سلیمانی رحمہ اللہ کے کلام "کان یضع للروافض" کا مصداق بھی یہی شخص ہے۔(2)

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ابن جریر طبری (سنی)کے بارے میں(مسح رجلین کے قائل ہونے کاشبہ) اس لیے پیدا ہوا؛ کیوں کہ ابن جریر جو مسح رجلین کا قائل تھا وہ ان کے علاوہ ایک اور شخص ہے جو شیعی تھا،ان دونوں کا نام اور ولدیت ایک جیسی ہے، میں نے اس (ابن جریر شیعی) کی شیعہ مذہب کے اصول و فروع کے بارے میں کتابیں دیکھیں ہیں۔(3)حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ابن جریر کے بارے مسح رجلین کے قائل ہونے کی جو حکایت بیان کی جاتی ہے تو اس سے مراد محمد بن جریر بن رستم رافضی ہے؛ کیوں کہ یہ ان کا مذہب ہے،(نہ کہ اہل سنت کا)۔(4)چوں کہ دونوں کا نام ولدیت اور کنیت ایک جیسی ہے؛ اس لیے

بہت سارے خواص بھی اس سے دھوکہ کھا جاتے ہیں،پہچان کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں کے دادا کا نام جدا جدا ہے،سنی ابن جریر کے داد کا نام یزید ہے اور رافضی ابن جریر کے دادا کا نام رستم ہے۔(5)

خود شیعہ مصنّفین اور اصحاب رجال میں سے بحرالعلوم طباطبائی،ابن الندیم، علی بن داؤد حلّی، ابو جعفر طوسی،ابو العباس نجاشی اور سیّد خوئی وغیرہ نے ابن جریر بن رستم طبری کا اہلِ تشیع میں سے ہونے کی تصریح کی ہے۔(6)

بہرحال دونوں ناموں اور ولدیت وکنیت میں تشابہ ہے، اسی تشابہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شیعہ علماء نے ابن جریر شیعی کی بہت ساری کتابوں کی نسبت ابن جریر سنی کی طرف کرنے کی کوشش کی ہے؛ چناں چہ ڈاکٹر ناصر بن عبداللہ بن علی قفازی نے "أصول مذهب الشيعة الإمامية الإثني عشرية عرض و نقد" میں لکھا ہے :"روافض نے اس تشابہ کو غنیمت جان کر ابن جریر سنی کی طرف بعض ان کتابوں کی نسبت کی ہے جس سے ان کے مذہب کی تائید ہوتی ہے،جیسا کہ ابن الندیم نے الفہرست،ص:۳۳۵ میں "كتاب المسترشد في الإمامة" کی نسبت ابن جریر سنی کی طرف کی ہے؛ حالاں کہ وہ ابن جریر شیعی کی ہے،دیکھیے: طبقات أعلام الشيعة في المائة الرابعة،ص:۲۵۲،ابن شهر آشوب،معالم العلماء، ص:۱۰۶،

آج بھی روافض بعض ان اخبار کی نسبت امام طبری کی طرف کرتے ہیں جن سے ان کے مذہب کی تائید ہوتی ہے؛حالاں کہ وہ اس سے بری ہیں،دیکھیے: الأميني النجفي، الغدير: ۲۱۴/۱-۲۱۶۔

روافض کے اس طرزِ عمل نے ابن جریر طبری سنی کو ان کی زندگی میں بہت سارے مصائب سے دوچار کیا؛ یہاں تک کہ عوام میں سے بعض لوگوں نے انھیں رفض سے متہم بھی کیا، جیسا کہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔(دیکھیے:البدایہ و النہایہ: ۱۴۶/۱۱)

حواشی :

(1) طبقاتِ الشافعية الكبرىٰ: ۱۳۸،۱۳۵/۲،تذكرة الحفاظ : ۷۱۶،۷۱۰/۲،ميزان الاعتدال :۴۹۸/۳، ۴۹۹، لسان الميزان :۱۰۰/۵، ۱۰۳

(2) تذكرة الحفاظ : ۷۱۶ ،۷۱۰/۲،ميزان الاعتدال :۴۹۹/۳،۴۹۸،لسان الميزان :۱۰۳/۵،۱۰۰

(3) حاشية الإمام ابن القيم على سنن أبي داؤد في ذيل عون المعبود: ۲۰۵/۲

(4) لسان الميزان :۱۰۳/۵

(5) ميزان الاعتدال :۴۹۹/۳،لسان الميزان :۱۰۳/۵

(6) الفوائد الرجالية:۱۹۹/۷،مكتبة العلمين الطوسي و بحر العلوم في نجف الأشرف،مكتبة الصادق طهران، الفهرست،ص:۵۸، رجال ابن داؤد للحلّي:۳۸۶/۱، رجال الطوسي لأبي جعفر الطوسي: ۲۴۲/۲، مؤسسة النشر الإسلامي قم، رجال النجاشي لأبي العباس أحمد بن علي النجاشي: ۳۷۸/۱، مؤسسة النشر الإسلامي قم، معجم رجال الحديث للسيد الخوئي: ۱۳۲/۱، ۱۵۴/۱۲، ايران

تاریخ طبری - مصادر

ابن جریر نے اپنی تاریخ کی ابتدا حدوثِ زمانہ کے ذکر، اول تخلیق یعنی قلم و دیگر مخلوقات کے تذکرہ سے کی، پھر اس کے بعد آدم علیہ السلام اور دیگر انبیاء ورسل کے اخبار و حالات کو تورات میں انبیاء کی مذکورہ ترتیب کے مطابق بیان کیا؛ یہاں تک کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک تمام اقوام اور ان کے واقعات کو بھی بیان کیا ہے۔ اسلامی تاریخ کے حوادث کو ہجرت کے سال سے لے کر ۳۰۲ھ تک مرتب کیا اور ہر سال کے مشہور واقعات و حوادث کو بیان کیا۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں حدیث، تفسیر، لغت، ادب، سیرت، مغازی، واقعات و شخصیات، اشعار، خطبات اور معاہدات وغیرہ کو خوبصورت اسلوب میں مناسب ترتیب کے ساتھ ہر روایت کو اس کے راوی اور قائل کی طرف (بغیر نقد و تحقیق کے) منسوب کیا کہ اس کو کتاب اور فصول کے عنوان سے تقسیم کر کے ان کو علماء کے اقوال سے مزین کیا ہے.

طبری نے اپنی اس تصنیف کے لیے جن مصادر کا انتخاب کیا وہ یہ ہیں

1. تفسیر مجاہد اور عکرمہ وغیرہ سے نقل کی
2. سیرت ابان بن عثمان، عروہ بن زبیر، شرجیل بن سعد، موسی بن عقبہ اور ابن اسحاق سے نقل کی
3. ارتداد اور فتوحاتِ بلاد کے واقعات سیف بن عمر اسدی سے نقل کیے،
4. جنگ جمل اور صفین کے واقعات ابو محنف اور مدائنی سے نقل کیے،
5. بنو امیہ کی تاریخ عوانہ بن حکم سے نقل کی
6. بنو عباس کے حالات احمد بن ابو خیثمہ کی کتابوں سے لکھے
7. اسلام سے قبل عربوں کے حلات عبید بن شریہ الجرھمی، محمد بن کعب قرظی اور وھب بن منبہ سے لیے
8. اہل فارس کے حالات فارسی کتابوں کے عربی ترجموں سے لیے،
9. پوری کتاب میں مصنف کا اسلوب یہ ہے کہ واقعات و حوادث اور روایات کو ان کی اسناد کے ساتھ بغیر کسی کلام کے ذکر کرتے چلے گئے ہیں
10. جن کتابوں اور مؤلفین سے استفادہ کیا ہے تو جگہ جگہ ان کے ناموں کی صراحت کی ہے
11. تاریخِ طبری کے بہت سارے مکملات لکھے گئے اور کئی لوگوں نے اس کا اختصار بھی کیا اور خود طبری نے سب سے پہلے اس کا ذیل لکھا ، بعض حضرات نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، پھر فارسی سے ترکی زبان میں بھی ترجمہ کیا گیا۔

تاریخ طبری - دروغ گو اور بد راویوں کی روایات کا اجمالی حاکہ

علامہ ابن جریر بن یزید طبری بہت بڑے اور بلند مرتبہ کے عالم تھے، خاص کر قرونِ ثلاثہ کی تاریخ کے حوالہ سے ان کا نام اور کتاب کسی تعارف کے محتاج نہیں ،قدیم و جدید تمام مؤرخین نے ان سے استفادہ کیا. ان ساری خصوصیات کے باوجود تاریخ طبری میں جگہ جگہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے متعلق ایسی بے بنیاد اور جھوٹی روایات مروی ہیں، جن کی کوئی معقول و مناسب توجیہ نہیں کی جاسکتی ہے ،جب کہ عدالتِ صحابۂ کرام پر موجود قطعی نصوص قرآن و سنت اور اجماعِ امت کے پیش نظر منصف مزاج اہل علم امام طبری اور خاص کر ان کی تاریخ میں مروی اس طرح کی روایات پر کلام کرنے پہ مجبور ہوئے ہیں، روایات پر کی گئی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ تاریخ طبری میں بڑے بڑے دروغ گو ، کذّاب اور متہم بالکذب راویوں کی روایات بھی جگہ جگہ موجود ہیں۔

تاریخ طبری کی روایات کا ایک جائزہ لینے کے لیے ڈاکٹر خالد علال کبیر صاحب نے تاریخ طبری میں موجود ثقہ و غیر ثقہ راویوں کی روایات کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا ہے؛ انہوں نے تاریخِ طبری میں اس کے بارہ (۱۲) مرکزی رواۃ کی روایات کا جائزہ لیااور ان میں سے سات راوی کذّاب یا متہم بالکذب ہیں اور پانچ ثقہ ہیں۔

دروغ گواور متہم بالکذب راویوں کی روایات کا اجمالی خاکہ :

1. محمد بن سائب کلبی کی بارہ (۱۲) روایات،
2. حشام بن محمد کلبی کی پچپن (۵۵) روایات ،
3. محمد بن عمر کی چار سو چالیس (۴۴۰)روایات ،
4. سیف بن عمر تمیمی کی سات سو (۷۰۰)روایات ،
5. ابو محنف لوط بن یحی کی چھ سو بارہ (۶۱۲)روایات،
6. ہیثم بن عدی کی سولہ(۱۶) روایات،
7. محمد بن اسحاق بن سیار (یسار)(۲۵) کی ایک سو چونسٹھ (۱۶۴)روایات ہیں،

ان سب کی روایات کا مجموعہ جن کو مؤرخ طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے وہ انیس سو ننانوے(۱۹۹۹) ہے۔

ثقہ راویوں کی روایات کا اجمالی خاکہ :-

1. زبیر بن بکار کی آٹھ(۸)روایات ،
2. محمد بن سعد کی ایک سو چونسٹھ (۱۶۴)روایات ،
3. موسی بن عقبہ کی سات(۷)روایات ،
4. خلیفہ بن خیاط کی ایک(۱) روایت ،
5. وھب بن منبہ کی چھیالیس (۴۶)روایات ہیں۔

تاریخ طبری کے ان پانچ ثقہ راویوں کی روایات کا مجموعہ دو سو نو(۲۰۹) ہے۔

گویا تاریخ طبری میں دو سو نو(۲۰۹)ثقہ روایات کے مقابلہ میں ان سات دروغ گو اور متہم بالکذب راویوں کی انیس سو ننانوے(۱۹۹۹) روایات ہیں، ان دونوں کے تناسب سے اندازہ لگاجاسکتا ہے کہ تاریخ طبری جیسی قدیم اور مستند سمجھی جانے والی کتاب کا جب یہ حال ہے تو تاریخ کی باقی کتابوں کا کیا حال ہو گا۔(

(تفصیل کے لیے دیکھیے : مدرسة الكذابين في رواية التاريخ الإسلامي وتدوينيه، ص:۴۵۔۴۷،دار البلاغ الجزائر)

اس تفصیل سے ساری تاریخ کی تغلیطیاتردید بالکل مقصود نہیں اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے. طبری میں ان راویوں کی صرف وہ روایات جن میں صحابہ پر سخت تنقیداور بہتان لگائے گئے ہیں اور مصنف کی بات کو ماننے سے صحابہ کرام کی شخصیت پر اور انکے متعلق قرآن و حدیث کی گواہی پر حرف آتا ہے۔ یہ ان روایات کے راویوں کی شناخت کے لیے ایک خاکہ بیان کیا گیا ہے جس سے اس قسم کی روایات کی پہچان،ان پر اعتبار اور تحقیق کرنے میں آسانی ہوسکتی ہے۔

تاریخ طبری - محقق علماء کی آراء

علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر کی رائے :-

علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر رحمھما اللہ نے طبری کی توثیق کرنے کے ساتھ ساتھ دبے لفظوں میں ان کے تشیع کی طرف میلان کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے: ''ثِقَةٌ صَادِقٌ فِيهِ تَشَيُّعٌ يَسِيرٌ وَمُوَالَاةٌ لَاتَضُرُّ''.(1)

شاید ان دونوں حضرات کے کلام کامقصد یہ تھا کہ چوں کہ علامہ طبری نے اپنی تاریخ میں ایسی روایات بغیر نقد و کلام کے نقل کی ہیں،جن سے ان کا تشیع کی طرف میلان معلوم ہوتا ہے ،لہٰذا اس تصریح کے بعد طبری کی وہ تمام روایات جن سے اہلِ تشیع کے مخصوص افکار کی تائید ہوتی ہے وہ غیر معتبر قرار پائیں گی۔

عصر حاضر کے اک محقق مولانا محمد نافع صاحب کا تبصرہ:-

تاریخ طبری میں منقول معتضد باللہ عباسی کا رسالہ جسے مؤرخ طبری نے ۲۸۴ھ کے تحت بلا کسی نقد و تحقیق و تمحیص اور کلام کے نقل کیا ہے، جس میں حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں حضرات کے خلاف سب و شتم اور لعن طعن کرنے کے جواز میں مواد فراہم کیا اور اس میں موجباتِ لعن و طعن درج کیے ہیں،اس رسالہ پر تنقید کرتے ہوئے "الطبری کی حکمتِ عملی" کے تحت مولانا محمد نافع نے" فوائدِنافعہ "میں جو کچھ فرمایا وہ من و عن پیش خدمت ہے:

"غور طلب بات یہ ہے کہ صاحب التاریخ محمد ابن جریر الطبری کے لیے عباسیوں کے اس فراہم کردہ غلیظ مواد کو من و عن نقل کے لیے اپنی تصنیف میں شامل کرنے کا کون سا داعیہ تھا؟اور اس نے کون سی مجبوری کی بنا پر یہ کارِ خیرانجام دیا؟ گو یا الطبری نے اس مواد کو اپنی تاریخ میں درج کر کے آنے والے لوگوں کو اس پر آگاہ کیا اور سب وشتم اور لعن طعن کے جو دلائل عباسیوں نے مرتب کروائے تھے، ان پر آئندہ نسلوں کو مطلع کرنے کا ثواب کمایا؟چناں چہ شیعہ اور روافض رسالۂ مذکورہ میں مندرجہ مواد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنی کتب میں ابو سفیان رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر مطاعن قائم کرتے ہیں اور شدید اعتراضات پیدا کرتے ہیں۔(2)

مولانا مہرمحمد صاحب کی رائے

ابن جریر طبری کا مذہب ،اس عنوان کے تحت مولانا مہرمحمد صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ وہی امام طبری المتوفی ۳۱۰ھ ہیں جنہیں اہلِ بغداد نے تشیع سے متہم کر کے اپنے قبرستان میں دفن نہ ہونے دیا تھا(3)،گو شیعہ نہیں ہیں؛ تاہم اپنی تاریخ یا تفسیر میں ایسی کچی پکی روایات خوب نقل کر دیتے ہیں جو شیعہ کی موضوع یا مشہور کی ہوئی ہوتی ہیں۔(4)

عرب علماء کی رائے:-

معاصر عرب اہل علم حضرات میں سے ڈاکٹر خالد علال کبیر صاحب (5)نے اپنی کتاب ''مدرسة الكذابين في رواية التاريخ الإسلامي وتدوينه'' میں مؤرخ طبری کے اس مخصوص طرزِ عمل کے بارے میں لکھا ہے کہ

"میرے نزدیک انھوں نے یہ (یعنی تحقیق و تمحیص کے بغیر صرف اسانید کے ساتھ روایات کو نقل کر کے) ایک ناقص کام کیا ہے، اور ان تمام روایات کے وہ خود ذمہ دار ہیں جو انہوں نے اپنی تاریخ میں مدون کی ہیں،پس انہوں نے عمداً دروغ گو راویوں سے بہ کثرت روایات نقل کیں اور ان پر سکوت اختیار کیا، یہ انتہائی خطرناک معاملہ ہے جو بعد میں آنے والی بہت ساری نسلوں کی گمراہی کا

سبب بنا، انھیں (طبری) چاہیے تھا کہ وہ ان دروغ گو راویوں کا بغیر ضرورت کے تذکرہ نہ کرتے، یا ان پر نقد کرتے اور ان کی روایات کی جانچ پڑتال کرتے، صرف ان کی اسانید کے ذکر پر اکتفا کر کے سکوت اختیار نہ کرتے۔

نقدِ روایات اس لیے ضروری تھا کہ تاریخِ طبری کا مطالعہ کرنے والوں میں غالب اکثریت ان لوگوں کی ہے جن میں اتنی علمی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ان روایات پر سند و متن کے اعتبار سے نقد کر سکیں،اگر اس سے استفادہ کرنے والے صرف حدیث، تاریخ و دیگر علوم میں متبحر ہوتے تو یہ طے شدہ بات تھی کہ وہ نقد و تمحیص کا عمل انجام دیتے۔(6)

ڈاکٹر صاحب موصوف مزید لکھتے ہیں کہ

" اس معاملہ کو اس سے بھی زیادہ سنگین اس بات نے کردیا کہ طبری کے بعد آنے والے اکثر مؤرخین نے قرونِ ثلاثہ کے بارے میں ان سے بہ کثرت روایات نقل کی ہیں ، جیسا کہ ابن جوزی نے اپنی کتاب "المنتظم" میں، ابن الاثیر نے "الکامل" میں اور ابن کثیر نے "البدایہ" میں بغیر سند کے نقل کیا ہے، اور ان حضرات کا اس طرح بغیر سند کے روایات نقل کرنے سے ثقہ اور دروغ گو راویوں کی روایات خلط ملط ہوگئیں ہیں، بسا اوقات تاریخ طبری کی طرف مراجعت کے بغیر ان روایات میں تمیز مستحیل ہوجاتی ہے۔(7)

خود علامہ طبری کا اپنی تاریخ کے مقدمہ میں واضح طور پر لکھا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں بغیر نقدو تمحیص کے مختلف فرقوں اور گروہوں کے راویوں کی روایات کو ان کی اسانید کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ہم قارئین کے اطمینان قلبی کی خاطر علامہ طبری کی وہ پوری عربی عبارت پیش خدمت ہے، جس میں انہوں نے محض سند کے ساتھ بغیر نقد و تمحیص کے روایات ذکر کرنے کا اعتراف کیا ہے:

''فَمَا يَكُنْ فِي كِتَابِيْ هَذا مِنْ خَبَرٍ ذَكَرْناه عن بَعْضِ الماضِيْنَ مِمّا يَسْتَنْكِرُه قَارِيهِ، أو يَسْتَشْنِعُه سَامِعُه، مِنْ أَجلِ أنّه لَمْ يَعْرِفْ لَه وَجْهاً فِي الصِّحّةِ، وَلاَ مَعْنًى فِي الْحَقِيْقَةِ، فَلْيَعْلَمْ أنّه لَمْ يُؤْتَ فِيْ ذٰلِكَ مِنْ قِبَلِنَا، وَ إنّما مِنْ قِبَلِ بَعْضِ نَاقِلِيْهِ إِلَيْنَا، وَأنّا إنّما أدّيْنَا ذٰلِكَ عَلى نَحْوِمَا أُدِّيَ إِلَيْنَا''.(۲۷)

کیا صرف سند کے ساتھ رطب و یابس، غث و سمین اور ثقہ و غیر معتبر ہر طرح کی روایات کا نقل محض کسی بھی ثقہ مصنف کے لیے معقول عذر بن سکتا ہے؟ کیا اس بنیاد پر ثقہ مصنف کی نقل کردہ ہر روایت کو قبول کیا جاسکتا ہے. ؟

حواشی :-

(1) میزان الاعتدال :۳/۴۹۹،لسان المیزان :۵/۱۰۰

(2) فوائدنافعہ:۱/۵۷۔۵۸،دار الکتاب لاہور

(3) معجم الأدباء :۶/۵۱۴

(4) ہزار سوال کا جواب ،ص:۷۹،مرحبا اکیڈمی

(5) موصوف نے جامعۃ الجزائر سے تاریخ اسلامی میں ڈاکٹریٹ لی ہوئی ہے۔

(6) مدرسة الكذابين في رواية التاريخ الإسلامي و تدوينه: ۱/۶۷، ۶۸

(7) حوالۂ سابق

تاریخ اسلام میں صحابہ کے کردار کو مجروح کرنے والی روایات پر ایک تحقیق

گزشتہ تحاریر میں ہم نے محققین کی تحقیق اور اسم ورجال کے حوالہ سے اہم تاریخی کتاب طبری میں موجود دروغ گو اور کذاب راویوں کے بارے میں تحقیق پیش کی. ان کے ثبوت میں ہم مشہور اور متنازعہ تاریخی واقعہ جنگ جمل اور جنگ صفین کے واقعات بیان کرنے والی راوی ابو محنف لوط کی تین مشہور روایات پر تجزیہ پیش کررہے ہیں، جس سے نا صرف ان واقعات کی حقیقت سمجھنے میں مدد ملے گی بلکہ ان راویوں کی مکاری اور طریقہ واردات بھی کھل کر سامنے آجائے گا۔ تحریر ناچاہتے ہوئے بھی طویل ہوگئی، قارئین کے مزاج کالحاظ رکھتے ہوئے چار قسطوں میں پیش کی جائے گی

تحریر کے اہم موضوعات:-

1. جنگ جمل اور صفین کا پس منظر
2. جنگ صفین کے بعد تحکیم کا واقعہ
3. تحکیم کے لیے مقرر کیے گئے ثالثوں کا فیصلہ
4. فیصلے کے وضاحت طلب امور
5. فیصلہ پر ایک نظر
6. ثالثوں کی شخصیت پر کیے گئے اعتراضات کا جائزہ

جنگ جمل اور صفین کا پس منظر:۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص لینے کے مسئلے پر امت دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ صحابہ کی جماعت کا یہ موقف تھا کہ ہم علی رضی اللہ عنہ کی بیعت اس وقت کریں گے جب تک عثمان رضی اللہ عنہ کے خون ناحق کا قصاص لیا جائے گا، جب کہ علی رضی اللہ عنہ کا مطالبہ تھا کہ یہ لوگ بیعت کرلیں پھر بعد میں جب حالات سازگار ہو جائیں گے تو قصاص لے لیا جائے گا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ اور انکے ساتھیوں کا موقف یہ تھا کہ چونکہ قاتلین عثمان ہی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت قبول کرنے پر مجبور کر کے سب سے پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور ملک کے انتظام و تدبیر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تمام فیصلوں میں وہ پوری طرح دخیل ہیں اسی لئے حضرت علی رضی اللہ نہ خون عثمان کا قصاص لے پارہے ہیں اور نہ ہی اس صورتحال کے برقرار رہتے ہوئے وہ قصاص لے سکیں گے، لہذا فتنہ کے سدباب کی بس یہی صورت ہے کہ یا تو وہ خود قصاص لیکر ان قاتل سبائیوں سے اپنی گلو خلاصی کریں یا پھر ان قاتلوں کو ہمارے حوالہ کردیں تاکہ ہم انکو کیفر کردار تک پہنچا کر پوری ملت اسلامیہ کے زخمی دلوں کو سکون پہنچا سکیں، یہ مطالبات ان بلوائیوں / سبائیوں / قاتلان عثمان کے لیے انتہائی تباہ کن تھے اس لیے ان کی ریشہ دوانیوں اور کوششوں سے ان دونوں گروہوں میں اختلاف بڑھتے گئے اور نہ چاہتے ہوئے بھی ان میں دو جنگیں جنگ جمل اور جنگ صفین ہو گئیں۔ صفین میں جب جنگ زوروں پر تھی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دونوں طرف ہونے والے مسلمانوں کے اس جانی نقصان سے بچنے کے لیے حضرت علی کو قرآن پر مصالحت کی دعوت دی جس کو انہوں نے فورا منظور کرلیا اور دونوں طرف جنگ بندی کا اعلان ہو گیا۔

اس جگہ ہم نے تاریخ کی ان مکذوبہ سبائی تفصیلات کو بیان کرنے سے قصداً گریز کیا ہے جن میں بیان کیا گیا ہے اپنی شکست کو قریب دیکھ کر معاویہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے قرآن کی بے حرمتی کرتے ہوئے اسے نیزوں پر بلند کر دیا تاکہ علی کی فوج منتشر ہو جائے اور ہم شکست سے بچ جائیں اور یہ کہ علی رضی اللہ عنہ اس جنگ بندی پر راضی نہیں تھے، بار بار اپنی تقریروں (جن میں معاویہ اور مخالف صحابہ کو منافق اور دھوکے باز کہنے اور گالیاں دینے کا ذکر ہے) کے ذریعے اپنے ساتھیوں کو جنگ جاری رکھنے پر اصرار کرتے اور ابھارتے رہے، لیکن آپ رضی اللہ عنہ کی اپنی جماعت کے سامنے ایک نہ چلی اور آخر بادل نخواستہ تحکیم پر رضامند ہوئے۔ ان روایات میں راویوں کا جھوٹ اور بہتان کئی باتوں سے ظاہر ہے،

یہ روایات اور آگے جن روایات کا ذکر آئے گا یہ تاریخ طبری اردو ایڈیشن دارالاشاعت کراچی جلد تین صفحہ 620 تا 650 پر دیکھی جاسکتی ہیں.. تفصیل ان روایات پر تبصرہ میں بھی آگے آئے گی۔

جنگ صفین کے بعد تحکیم کا واقعہ:-

جنگ بندی کے بعد تحکیم ہوئی یعنی کتاب اللہ کے حکم کے مطابق حضرت علی رضی اللہ کی طرف سے حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ثالث مقرر ہوئے کہ یہ دونوں کتاب و سنت کے مطابق نزاعی معاملہ کا جو فیصلہ کریں گے وہ فریقین کے لئے قابل قبول ہو گا۔ اس فیصلہ کی شرائط کے متعلق جو ابتدائی دستاویز تیار ہوئیں وہ تاریخ کی سب بڑی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں ہم طوالت سے بچنے کے لیے اس کے بنیادی نکات کو بیان کرتے ہیں۔

1. حضرت علی رضی اللہ اور انکے تمام ساتھیوں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور انکے تمام ساتھیوں کو مساویہ طور پر اہل ایمان تسلیم کیا گیا۔

2. دونوں ثالثوں کی عدالت اور انصاف پر فریقین نے اپنے کامل اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے ان کو اس بات کا پابند کیا کہ وہ ایسا فیصلہ کریں جس سے یہ عارضی جنگ بندی مستقل اور پائیدار امن کی صورت اختیار کرے اور دوبارہ اختلاف و جنگ کی صورت پیدا نہ ہونے پائے۔

3. ثالثوں پر ذمہ داری ڈالی گئی کہ وہ اپنا فیصلہ تحریری طور پر پیش کریں۔

4. شہادت و مشاورت اور دوسرے تمام ضروری مراحل سے گذرنے کے بعد ثالثوں کے فیصلہ سنانے کے لیے رمضان کا مہینہ مقرر کیا گیا۔

ثالثوں کا فیصلہ:۔

یہ معاہدہ چونکہ خیر القرون میں نبی کامل کے تربیت یافتہ جید اصحاب کی ان دو جماعتوں کے درمیان ہوا تھا جن سے پاکیزہ اور لائق تقلید انسانی گروہ کا روئے زمین پر تصور نہیں کیا جاسکتا، اس لیے اس تحکیم کے لیے جس طرح کی بہترین شرائط رکھی گئی تھیں فیصلہ بھی انہی کے مطابق آنا یقینی تھا۔
تاریخی روایتوں میں یہاں بات کو بڑے طریقے سے ایک الگ رخ پر موڑ کر فتنہ کا دروازہ کھول دیا گیا۔ تاریخ اس فیصلہ کی تفصیلات میں ان سبائی راویوں کی روایتوں کی بنیاد پر کچھ اور ہی کہانیاں سناتی ہے۔ معاہدہ کی شرائط پر غور کیجیے ان میں کن باتون کو اہمیت دی گئی اور تاریخ فیصلہ کیا بتاتی ہے۔ جنگیں اور پھر معاہدہ قاتلان عثمان سے قصاص کے متعلق ہوا اور تاریخ میں یہ سبائی روای انتہائی مکاری سے فیصلہ میں بالکل الٹ خلافت کا تنازعہ بتاتے ہیں اور

پھر اپنے غیظ القلب کی تسکین کے لیے اصحاب کا ایک دوسرے کو گالیاں دینا، برا بھلا کہنا بتلاتے ہیں۔ تاریخ طبری، ان اثیر اور ابن خلدون وغیرہ نے فیصلہ کی جو تفصیلات دیں انکا خلاصہ یہ ہے۔

"دونوں ثالث مجمع میں آئے جہاں دونوں طرف چار چار سو اصحاب کرام رضوان اللہ اور ان کے علاوہ کچھ غیر جانبدار جید صحابہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ موجود تھے۔ حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہم دونوں اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ ہم علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں کو خلافت سے معزول کر لیں، پھر لوگ باہمی مشورہ سے جس کو پسند کریں خلیفہ کی حیثیت سے منتخب کر لیں، لہذا میں علی اور معاویہ دونوں کو معزول کر کے معاملہ آپ لوگوں کے ہاتھ میں دیتا ہوں کہ اب آپ جسے چاہیں اپنا نیا امیر بنالیں، اس کے بعد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا کہ جو کچھ میرے ساتھی نے ابھی کہا اسے آپ لوگوں نے سن لیا کہ انہوں نے اپنے آدمی علی رضی اللہ کو معزول کر دیا میں بھی انکی طرح علی رضی اللہ عنہ کو معزول کرتا ہوں اور اپنے آدمی معاویہ رضی اللہ کو خلاف پر قائم رکھتا ہوں۔ یہ سنکر حضرت ابو موسی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو سے کہا تم نے یہ کیا کیا؟ خدا تمہیں توفیق نہ دے، تم نے تو ہمیں دھوکہ دیا ہے اور گنہگار بنے، تمہاری مثال تو اس کتے کی ہے جس پر بوجھ لادو تو بھی ہانپے، اس کے جواب میں حضرت عمرو نے کہا کہ تمہاری مثال اس گدھے کی ہے جو بوجھ ڈھوئے پھرتا ہے۔ دوسرے صحابہ نے حضرت ابو موسی کو طعنے دینے شروع کیے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ نے کہا کہ ابو موسی تمہارے حال پر افسوس ہے کہ تم عمرو کی چالوں کے مقابلے میں بہت کمزور نکلے، حضرت عبد الرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ابو موسی اگر اس سے پہلے مر گئے ہوتے تو ان کے حق میں زیادہ اچھا ہوتا"۔ پھر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مجمع سے اٹھ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور انکو خلافت کی مبارکباد پیش کی، دوسری طرف حضرت ابو موسی رضی اللہ عنہ اتنے شرمندہ تھے کہ وہ پھر حضرت علی رضی کو منہ بھی نہ دکھا سکے اور سیدھے مکہ چلے گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ پہنچ کر اپنی تقریروں میں مخالف صحابہ کو برا بھلا کہا اور دوبارہ جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ لیکن ان کے لوگوں نے انکا ساتھ نہ دیا اور خوارج کے فتنے نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے مزید ایک درد سر پیدا کر دیا تھا۔

روایات میں فیصلے کے متعلق پیش کی گئی تفصیلات کے وضاحت طلب امور:۔

1. فیصلہ کی تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ دونوں خلیفہ تھے، پھر حضرت ابو موسی رضی اللہ عنہ نے دونوں کو معزول کر دیا اور عمرو رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو برقرار رکھا، حالانکہ یہ کسی گری پڑی تاریخی روایت سے بھی ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ سے پہلے یا بعد میں اپنی خلافت کا اعلان کر کے اسکے لیے کسی ایک شخص سے بھی بیعت لی ہو، اس کے مقابلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بیعت ہو چکی تھی اور انہیں امیر المومنین و خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا تھا، صرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور انکے ساتھ اصحابہ نے فی الحال بیعت نہیں کی تھی، وہ بھی اس لیے نہیں کہ وہ خود خلافت کے مدعی تھے بلکہ اس لیے کہ انکا مطالبہ تھا کہ پہلے قاتلان عثمان غنی سے قصاص لے لیا جائے پھر ہم بیعت کریں گے، پھر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلافت پر قائم رکھنے اور علی رضی اللہ عنہ کو معزول کرنے کی داستانیں کس بنیاد پر ؟

2. تحکیم کی دستاویز میں یہ شرط رکھی گئی تھی کہ ثالثوں کا فیصلہ تحریری ہو گا، لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ثالثوں نے محض تقریریں کیں ،اگر فیصلہ تحریری شکل میں نہیں تھا تو فریقین کی طرف سے شریک مجلس چار چار سو اصحاب اور ان کے علاوہ دوسر غیر جانبدار بزرگ حضرات میں سے کسی نے تحریری فیصلہ کا مطالبہ کیوں نہیں کیا ؟ روایت دونوں کا مناظرہ دکھاتی ہے یہاں تحریری فیصلہ پڑھ کر سنایا جانا تھا۔
3. اس روایت کے مطابق حضرت ابو موسی رضی اللہ عنہ کی (معاذ اللہ) ناسمجھی ، بیوقوفی اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کی چالاکی کے باوجود دونوں کا کوئی متفقہ فیصلہ سامنے نہیں آیا ، نا مجمع نے دونوں کی تقریروں کے بعد متفقہ طور پر کسی کو منتخب کیا۔پھر وہ کون سا فیصلہ ہے جس پر حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ کو خلافت کی مبارکباد دی اور حضرت علی رضی اللہ نے اس پر اپنی ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اسے رد کیا ؟
4. اس نام نہاد فیصلہ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ نے اپنی خلافت کی عام بیعت کیوں نہیں لی ؟ کیا انہوں نے بھی فیصلہ کو رد کردیا تھا ؟۔
5. راوی کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے فیصلہ کی علی الاعلان مخالفت اور دونوں ثالثوں کو مجرم گردانے کے بعد شام پر دوبارہ چڑھائی کرنے کی تیاریاں شروع ہوئیں لیکن خارجیوں کے فتنے نے اپنی طرف متوجہ کردیا۔پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس کمزوری سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فاعدہ اٹھا کر کوفہ پر چڑھائی کیوں نہ کی، اگر وہ خلافت چاہتے تھے تو یہ تو علی رضی اللہ عنہ کو راستے سے ہٹانے کا بہترین موقع تھا، اس ناکام فیصلہ کے بعد جنگ بندی مستقل کیسے ہوگئی، دوبارہ دونوں میں اختلاف کیوں نہ سامنے آیا ؟
6. یہ چند امور وضاحت طلب ہیں جو اس وقت تک وضاحت طلب ہی رہیں گے جب تک ان روایتوں کے راوی ابو محنف لوط بن یحیی کی ان دروغ بافیوں کو صحیح تسلیم کیا جاتا رہے گا۔

فیصلہ پر ایک نظر:۔

ان وضاحت طلب امور کے علاوہ فیصلہ سے پہلے اور فیصلہ کے بعد کے حالات و واقعات کو بنیاد بنا کر یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس واقعہ کے متعلق تاریخی کتابوں میں مذکور ثالثوں کے فیصلے کی یہ تمام تفصیلات قطعا غلط ، گھڑی ہوئی اور محض اصحاب سے بدظن کرنے کی ایک سبائی سازش ہیں۔اصل فیصلہ مجموعی طور پر انتہائی کامیاب اور فریقین کے لیے قابل قبول اور عام مسلمانوں کے بہترین مفاد میں تھا کیونکہ :

1. دونوں ثالث ناصرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ بعد کے بھی سارے خلفائے راشدین اور صحابہ کے قابل اعتماد لوگ تھے اور ان کی فہم فراست، تدبر و سیاست اور فقہ و دیانت کو دیکھتے ہوئے ان کو ہر دور میں بڑی بڑی ذمہ داریاں اور عہدے عطا کیے گئے تھے۔یہ بات ناممکن تھی کہ وہ صرف اس ایک مسئلہ میں فتنہ کا دروازہ کھولنے والا انتہائی غیر دانشمندانہ فیصلہ کرتے۔
2. اگر ثالثوں نے اپنی ذمہ داریوں کو قطعا فراموش کرکے اور خدانخواستہ دین و دیانت کو بالائے طاق رکھ کر یہ غلط فیصلہ دیا ہوتا تو مجلس میں موجود آٹھ سو سے زائد چیدہ و نمائندہ اصحاب کرام رضوان اللہ خاموش تماشائی نہ بنے رہتے۔ایسا تو آج کے گئے

گذرے دور میں بھی نہیں ہوسکتا چہ جائیکہ عہد صحابہ رضی اللہ میں جہاں منبر پر کھڑے خلیفہ کو دو چادریں پہننے پر پوچھ لیا جاتا تھا کہ سب کو مال غنیمت سے ایک چادر ملی اس نے دو کہاں سے لائیں۔

3. ثالثوں کے تقرر کا مقصد یہی تھا کہ نزاعی مسئلہ ' جنگ کے بجائے امن کے ماحول میں طے ہوجائے اور امت خون خرابہ سے محفوظ ہوجائے، یہ بات واضح ہے کہ ثالثوں کے فیصلہ کے بعد رفتہ رفتہ کشیدگی کم ہوتی گئی اور پھر دوبارہ جنگ کی نوبت نہیں آئی، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ثالثوں کے اصل فیصلے (جس کو تاریخ سے غائب کردیا گیا) سے فریقین مطمئن ہوگئے تھے۔
4. مزید ابو محنف لوط مردود کی ان وضعی داستانوں پر یقین کرنے سے صحابہ کرام جیسی مقدس جماعت کی جو گھناؤنی تصویر ابھرتی ہے وہ تو اپنی جگہ اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ (نعوذ باللہ) وہ بد قسمت انسان تھے جن کا نہ کوئی سچا ہمدرد اور خیر خواہ تھا اور نہ انکی بات کو کوئی تسلیم کرتا تھا اور خود آپ اس قدر کمزور قوت فیصلہ کے مالک تھے کہ ہر دفعہ آپ کو دوسروں کی رائے تسلیم کرنی پڑتی تھی۔آپ ابو موسی کے بجائے مالک بن اشتر کو ثالث بنانا چاہتے تھے لیکن آپکی مرضی نہ چلی، آپ قرآن کو نیزوں پر اٹھانے کے بعد بھی جنگ جاری رکھنا چاہتے تھے، آپ نے اس کے لیے جوش آور تقریریں کیں اور دین کا واسطہ دیکر بھی جنگ کا حکم دیا اس کے علاوہ تحکیم کے فیصلہ کے بعد عراق جاکر بھی دوبارہ شام پر چڑھائی کرنے کے لیے اپنے حواریوں کو حکم دیا لیکن آپ ایسے کمزور اور مجبور خلیفہ تھے کہ آپ کے واسطے دینے پر بھی کسی نے آپکی بات نہ مانی۔

نعوذ باللہ من ھدہ الخرافات الباطلہ۔

ثالثوں کی شخصیت

حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ:۔

واقعہ تحکیم کی بنیاد پر حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ پر دو بہتان لگائے جاتے ہیں کہ اول یہ کہ آپ نہایت مغفل، بیوقوف اور سفینہ قسم کے آدمی تھے، اس لیے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ آپ کو چکمہ دینے میں کامیاب ہوگئے، دوئم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ پر پہلے سے ہی اعتماد نہیں تھا وہ کسی اور کو ثالث بنانا چاہتے تھے۔

یہ دونوں باتیں حضرت ابو موسی رضی اللہ عنہ کے زندگی کے ریکارڈ کے خلاف ہیں حقیقت میں آپ وہ شخص تھے جنکی زیرکی ودانائی، تدبر وسیاست، فہم فراست اور فقہ و دیانت داری پر نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ بعد کے سارے خلفائے راشدین نے بھرپور اعتماد کرتے ہوئے ان کو اہم علمی، سیاسی عہدوں کی ذمہ داری دی تھی، (انکی تفصیلات تاریخ اور انکی زندگی پر لکھی گئی کسی کتاب میں پڑھی جاسکتی ہے)۔پھر حضرت ابو موسی سے منسوب کوئی ایسا جھوٹا واقعہ بھی کسی تاریخی کتاب تک میں تحکیم سے پہلے کا نہیں ملتا جس سے انکی سفاہت پر کچھ روشنی پڑتی ہو بلکہ اس کے برعکس ان کے عبقری صفت ہونے کے ایسے حالات ملتے ہیں جن سے

ان کے صحابہ میں امتیازی مقام کا پتا چلتا ہے۔پھر اچانک ان کی بے عقلی اور سفاہت کی باتیں اور ان پر یہ بے اعتمادی کیسے سامنے آگئی۔ ؟

سچائی یہ ہے کہ حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ نے ثالثوں کی دستاویز وں میں درج شرائط کی پوری پابندی کرتے ہوئے کتاب وسنت کی ہدایت میں جنگ صفین کے اسباب کا پتا لگایا اور فریقین کے موقف کی خوبیوں و خامیوں کا جائزہ لیا اور پوری غیر جانبداری کے ساتھ غوروخوض کرنے ، نیز استصواب رائے کے بعد انہوں نے جو فیصلہ دیا وہ فیصلہ نہ صرف فریقین بلکہ بلا اختلاف تمام مسلمانوں نے تسلیم کیا ، فیصلہ کی تحریر کا متن تو سبائیوں کی ہاتھ کی صفائی کی وجہ سے تاریخ میں نہ آسکا ، لیکن فیصلہ کی برکات کو سبائی چھپانے پر قدرت نہیں رکھتے تھے . فیصلہ کے بعد نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان کوئی جنگ ہوئی اور نہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے خون عثمان کے قصاص کا مطالبہ ہوا اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے انہیں شام کی گورنری سے معزولی کے لیے اصرار ہوا۔اس فتنہ کا پوری طرح سدباب ہوگیا جس کے لیے ثالثوں کا تقرر ہوا تھا۔

اس شاندار کامیابی کے ہوتے بھلا حضرت ابو موسی کیوں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منہ چھپا کر مکہ جاتے ؟ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت ابو موسی کی یہ بے لوث و مخلصانہ خدمت اور انکی شاندار کامیابی انکی نسلوں تک کیلئے سرمایہ افتخار بنی رہی ، چنانچہ مشہور شاعر ذی الرمہ نے ان کے پوتے حضرت بلال بن برید بن ابی موسی رضی اللہ عنہ کی شان میں قصیدہ کہتے ہوئے اس شاندارکارنامہ کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

ابوك تلافى الدين والناس بعدما

تشاءوا وبيت الدين منقطع الكسر

ترجمہ ؛ آپ کے باپ تو وہ تھے جنہوں نے دین اور اہل دین کی اس وقت شیرازہ بندی کی جب دین کا قصر گرنے کے قریب پہنچ گیا تھا۔

فشداصارالدين ايام اذرح

وردحروباقد لقحن الى عقر

انہوں نے اذرح والے دنوں میں دین کے خیمہ کی طنابیں کس دیں اور ان جنگوں کو روک دیا جو اسلام کی نسل منقطع کرنے کا سبب بن رہی تھیں۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ، اسلام کے مایہ ناز جرنیل فاتح مصر اور 'دہاۃ عرب' میں شمار ہونے والے حضرت عمر و بن العاص رضی اللہ عنہ بھی سبائیوں کی دو طرفہ سازشوں سے تاریخ کی مظلوم شخصیتوں میں شامل ہوگئے۔جب خلیفہ ثالث حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں مصر کی گورنری سے معزول کرکے انکی جگہ حضرت عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا تو انکے اس فیصلہ پر عمرو رضی اللہ عنہ کی ناراضگی کو لے کر خلیفہ ثالث پر اقرباپروری کا الزام لگانے کے لیے سبائیوں نے ان (حضرت عمرو) کے خوب خوب فضائل بیان کیے، جب یہی عمرو مسلمانوں کے اختلاف سے پریشان ہو کر افہام تفہیم اور اصلاح کے لیے حضرت معاویہ کے پاس شام گئے اور انکے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان مصالحت کے ذریعے سبائی قاتلان عثمان سے قصاص لینے کے لیے راہیں ہموار کرنے کرنے لگئے تو یہی سبائی ان کے دشمن بن گئے ان پر ناصرف میدان جنگ میں قرآن نیزوں پر بلند کرانے ، ثالثی کے فیصلے میں عیاری دکھلانے وغیرہ جیسے بڑے الزام لگا دیے بلکہ ان کواپنی روایتوں میں دوسروں کی زبان سے خوب گالیاں بھی دلوائیں۔غرضیکہ وہی شخصیت جسے عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ہمہ صفات موصوف قرار دیا گیا اسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلاف میں ہمہ عیوب قرار دیدیا گیا۔یہ ہے سبائیت کا دوہرا معیار جسے صحیح تاریخی اسلام قرار دیکر جلیل القدر اصحاب رسول کی کردار کشی کی جارہی ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ پر ثالثی کے فیصلہ میں عیاری دکھلانے کے الزام کی حقیقت اوپر تحکیم اور حضرت موسی اشعری رضی اللہ عنہ کے تذکرہ میں بیان کی جاچکی ہے کہ اس فیصلہ کی دی گئی تفصیلات سب گھڑی ہوئی ہیں۔

آپ پر سب سے بڑے اعتراض کا سبب ابو محنف کی وہ روایت ہو جس میں بتایا گیا ہے کہ آپ کے مشورہ کے مطابق ایک جنگی چال کے طور پر جنگ صفین میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لشکر سے قرآن کو نیزوں پر بلند کروایا تاکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں پھوٹ پڑ جائے۔ابو محنف کی اس روایت کو لے کر رافضیوں اور نام نہاد سنیوں نے عمرو رضی اللہ عنہ کے خلاف اپنے دل کی کالک سے کئی کئی صفحے کالے کیے ہیں۔حالانکہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ ابن کثیر میں اس روایت کے ساتھ اسی واقعہ کے متعلق امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی بھی ایک باسند روایت نقل کی ہے، ان ناقدین اصحاب کواس سبائی کی روایت تو نظر آگئی اسی صفحہ پر یہ روایت نظر نہیں آئی جسے ایک صحابی روایت کررہے ہیں۔

" حضرت ابو وائل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں ہم صفین میں تھے تو جب اہل شام کے ساتھ جنگ خوب زور پکڑ گئی ، شامی ایک ٹیلے پر چڑھ گئے ، پھر حضرت عمر بن العاص رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ علی رضی اللہ عنہ کی طرف قرآن بھیج کر ان کو کتاب اللہ کی طرف دعوت دیں، وہ ہرگز انکار نہ کریں گے، تب قرآن لیکر ایک آدمی معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے آیا پھر اس نے کہا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان یہ اللہ کی کتاب فیصلہ کرنے والی ہے تو علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہاں میں تو اس کا زیادہ حقدار ہوں ، ٹھیک ہے ہمارے اور تمہارے درمیان یہ کتاب اللہ ہے جو فیصلہ کرے"۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے جنگ صفین میں شرکت کرنے والے صحابی حضرت ابو وائل رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے پتا چلتا ہے کہ عمر و بن العاص رضی اللہ کے مشورے سے نہ تو قرآن کو نیزوں پر بلند کرکے بے حرمتی کی گئی ، نہ علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تفرقہ پھیلانے کے لیے اور شکست سے بچنے کے لیے یہ ایک جنگی چال تھی۔حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کو اس بات کا احساس تھا کہ سبائیوں اور قاتلان عثمان نے اپنی جان بچانے کے لیے یہ جنگ ایک چال کے طور پر مسلمانوں کے درمیان شروع کروا دی ہے جس سے دونوں طرف مسلمان شہید ہورہے ہیں ، انہوں نے مسلمانوں کو اس بڑے جانی نقصان سے بچانے کے لیے یہ مخلصانہ

کوشش کی اور ایک آدمی کو قرآن دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج کر ان کو یہ پیش کش کی ہم اس فتنہ میں قرآن کو اپنا حکم بنا لیں اور اسی کے مطابق فیصلہ کرلیں، جسے علی رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر منظور کرلیا کہ میں تو قرآن کے فیصلہ کی طرف دعوت دینے اور اس پر عمل کرنے کا زیادہ حقدار ہوں ، چنانچہ بعد میں اسی مشورہ کے مطابق واقعہ تحکیم ہوا اور اللہ نے مسلمانوں کو حضرت عمرہ بن العاص رضی اللہ عنہ کے ذریعے ایک بڑے جانی نقصان اور فتنہ سے بچا لیا۔

غور کریں کہ اس واضح اور ایک صحابی کی مستند روایت کی تاریخ ابن کثیر میں موجودگی کے باوجود کس طرح ابو محنف سبائی کی اس داستان کا انتخاب کرکے گرما گرم سرخیوں کے ساتھ اسلامی تاریخی کتابوں میں پیش کیا گیا ہے۔

ابو محنف جنگ صفین والی اپنی گھڑی ہوئی اوپر پیش کردہ روایت میں آگے حضرت علی رضی اللہ کی ایک تقریر بھی پیش کرتا ہے جو انہوں حضرت عمر و بن العاص کی اس ' جنگی چال ' کو سمجھ کر عراق والوں کے سامنے کی۔پڑھیے اور سر دھنیے

" یہ معاویہ، یہ عمرو بن العاص، یہ ابن ابی معیط اور حبیب بن مسلمہ اور یہ ابن ابی سرح اور ضحاک بن قیس نہ اصحاب دین ہیں نہ اصحاب قرآن ، میں انہیں تم سے زیادہ جانتا ہوں، بچپن سے ان کا میرا ساتھ رہا ہے، یہ بدترین بچے تھے اور بدترین مرد ہیں، انہوں نے قرآن بلند کرنے کی یہ حرکت محض دھوکہ دینے کے لیے کی ہے ، خود انہیں قرآن سے کچھ تعلق نہیں ہے"۔

کیا اس پر یقین کیا جاسکتا ہے کہ داماد رسول حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان جلیل القدر اصحاب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ، حضرت ابن ابی معیط رضی اللہ عنہ حضرت حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ حضرت ابن ابی سرح رضی اللہ عنہ اور حضرت ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کے بارے میں اتنی بازاری زبان استعمال کی ہو ؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اعتماد یافتہ صحابیوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ دین وایمان سے خارج گردان سکتے تھے ؟ بدترین بچے اور بدترین مرد کون ہیں ؟ وہ کاتب وحی حضرت معاویہ رضی اللہ جن کے لیے حضور نے ھادی ومہدی کی دعا کی ، وہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جسکو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نے غزوہ ذات السلاسل کا کمانڈر مقرر فرمایا اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہ جیسے اجلہ صحابہ کو انکی ماتحتی میں جہاد کرنے کے لیے بھیجا اور اپنی وفات تک انہیں عمان کا والی مقرر کیے رکھا ؟ کیا یہ اپنے مقصد کے لیے قرآن شہید کر ان کے اوراق نیزوں پر بلند کراسکتے ہیں؟، کیا ان کے ساتھ پانچ سو لوگ اور صحابہ قرآن کی اس طرح بے حرمتی کرسکتے ہیں اور پھر خود حضرت علی رضی اللہ عنہ قرآن کے نیزوں پر بلند ہونے کے بعد بھی ایسی جنگ جاری رکھنے کے لیے تقریر کرسکتے ہیں جس کے نتیجے میں قرآن کا لوگوں کے پاؤں تلے روندھے جانے کا خدشہ ہو ؟

غور فرمائیں کہ یہ سبائی دروغ گو راوی صحابہ و اہلبیت کے کردار کو مجروع کرنے کے لیے کس حد تک گئے ہیں کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذمہ بھی ایک ایسی تقریر لگادی جو بالکل ان کے شایان شان نہیں۔اور پھر حیرت ہے ان سنی مورخین پر جنہوں نے بغیر تحقیق کے ان کہانیوں کو اسلامی تاریخ کے نام پر اپنی کتابوں میں ذکر کردیا۔مزید حضرت علی رضی اللہ عنہ کیسے حضرت معاویہ کے خلاف یہ زبان درازی کرسکتے ہیں حالانکہ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ خودلوگوں کو اس سے روکتے تھے۔

"جنگ صفین کے سلسلے میں جو لوگ حضرت معاویہ کے متعلق زبان درازی کرتے تھے، تو آپ نے انہیں اس سے روک دیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ امارت معاویہ رضی اللہ عنہ کو برا نہ سمجھو، کیونکہ وہ جس وقت نہ ہوں گے تو تم سروں کو گردنوں سے اڑتے ہوئے دیکھو گے۔

(تاریخ ابن کثیر جلد8 صفحہ 131)

حقیقت میں جنگ صفین کو ختم کروا کر ثالثی کے ذریعے مستقل جنگ بندی کروادینا ہی حضرت عمر و بن العاص رضی اللہ عنہ کا وہ کارنامہ تھا جس نے سبائیوں کی مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے لیے کی جانے والی ساری محنتوں اور تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا، اس لیے انہوں نے انہی واقعات کو لے کر انکی کردار کشی کی مہم چلائی۔

افسوس یہ ہے کہ ابو محنف کے بیانات کو تاریخ طبری کے صفحات میں دیکھ کر بلا تحقیق اسے نقل کرنے والوں نے سبائیوں کے ہاتھ اتنے مضبوط کردیئے ہیں کہ آج یہ روایتیں ہماری ایف اے ، بی اے، ایم اے کی تاریخ اسلام کی درسی کتابوں میں بھی بغیر کسی تحقیق و تبصرہ کے اسی طرح نقل ہوتی آرہی ہیں اور امت کا ایک اچھا خاصہ طبقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعمد صحابہ حضرت معاویہ، حضرت عمرو بن العاص، حضرت ابو موسی اشعری رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف سے سوء ظنی کا شکار ہے۔

اوپر تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہ ساری داستانیں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ کے کردار کو مجروح کرنے کے لیے وضع کی گئیں ہیں ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ہماری اس تفصیل کا مطلب یہ نہیں کہ صحابہ میں اختلاف ہو ا ہی نہیں یا ان سے غلطی ہو ہی نہیں سکتی ، ہم اس بات کے قائل ہیں کہ صحابہ معصوم عن الخطا نہیں ہیں ، بعض احادیث میں بھی انکے اختلاف اور غلطیوں کا ذکر ہے ، ہمارا اختلاف ان تاریخی روایات پر ہے جن میں تمام صحابہ پر کرپشن، اقربا پروری، منافقت، سیاسی جوڑ توڑ اور کھینچا تانی کے الزامات ہیں۔ قرآن و حدیث تمام صحابہ کے عادل ہونے پر شاہد ہیں ہی ، تاریخ سے بھی سیکڑوں مثالیں دیں جاسکتیں ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کا اختلاف شرعیت کے مطابق ہوتا تھا اور ان کا دامن ان گالیوں اور غیر اخلاقی زبان کے استعمال سے پاک ہوتا تھاجو انکے اختلاف کے واقعات میں سبائیوں راویوں کی ان روایتوں میں ان کے ذمہ تھوپی گئی ہیں۔

صحابہ اختلاف کے اصولوں جو انہیں دین نے سکھائے تھے' کے پوری طرح پابند تھے انکے اختلاف میں بھی امت کے لیے نمونہ تھا۔یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علی اور معاویہ کے درمیان قاتلان عثمان کے مسئلہ پر اختلاف کے باوجود ادب و احترام کا تعلق تھا ،چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دینی مسئلے پر فتوی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہی لیتے تھے۔مزید شیعہ کی اپنی کتابیں گواہ ہیں کہ حضرت علی، حسن اور حسین رضی اللہ عنہ ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ حضرت معاویہ کا احترام کرتے اور انکے اختلاف کو دینی اختلاف سمجھتے تھے۔ مضمون کی طوالت کے ڈر سے ہم صرف علی رضی اللہ عنہ کا حوالہ دیتے ہیں۔شیعہ کی مشہور کتاب نہج البلاغہ میں ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تمام شہریوں کی طرف گشتی مراسلہ جاری کیا کہ صفین میں ہمارے اور اہل شام کے درمیان جو جنگ ہوئی اس سے کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو، ہمارا رب، نبی اوردعوت ایک ہے۔ہم شامیوں کے مقابلے میں اللہ و رسول پر ایمان و یقین میں زیادہ نہیں اور نہ وہ ہم سے زیادہ ہیں۔ہمارا اختلاف صرف قتل عثمان میں ہے۔

(نہج البلاغہ جلد2، صفحہ 114)

اللھم ثبت قلبی علی دینک

تاریخ اسلامی پر جھوٹ کے اثرات:۔

دروغ گوراویوں کے اس مخصوص مکتبۂ فکر نے ہماری پوری تاریخِ اسلامی پر عام طور سے اور قرونِ ثلاثہ پر خاص طور سے بہت سے زہریلے اور بُرے اثرات چھوڑ ، مقامِ فکر یہ ہے کہ ان دروغ گو اور گذّاب(اور متہم بالکذب) لوگوں کی روایات ہماری تاریخ ، ادب اور دینی تصانیف میں سرایت کر گئیں، اور ان کے ایک بڑے اور معتدبہ حصہ کو اپنے جھوٹ سے فاسد کرڈالا، جس کے نتیجہ میں ثقہ روایات کے ساتھ اباطیل، خرافات و متنا قضات،ان کتابوں میں شامل ہوگئیں.

کذّاب اور دروغ گو رایوں کی یہ موضوع و من گھڑت اور نصوص شریعت و حاملینِ دین متین سے متصادم روایات ہی امتِ مسلمہ میں افتراق و انتشار اور تمام گروہی اختلافات کی اساس و بنیاد ہیں، جن کو صراطِ مستقیم سے منحرف فرقوں نے جب مذہبی قداست کا لبادہ اوڑھا دیا تو اس مکتبۂ فکر کے ماننے والوں نے ان روایات کو دین اور رجال پر طعن کرنے ، گمراہ افکار کی نصرت و تائید ، مسلمہ حقائق اور متوارث تاریخ اسلامی میں تشکیک پیدا کرنے کے لیے بطور سلاح کے استعمال کرنا شروع کردیا۔

امتِ مسلمہ کا درد رکھنے والا منصف مزاج محقق ضرور اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ ان دروغ گو مکتبہ فکر کے گمراہ لوگوں نے اپنے مخصوص افکار و عقائد کی بنیاد اپنے مکتبۂ فکر کے ان مخصوص اور دروغ گو رایوں کی روایات پر رکھی ہے، اور قرآنِ کریم اور سنتِ صحیحہ و دیگر نصوصِ شریعت کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔

اگر یہ گمراہ فرقے آج بھی قرآنِ کریم، سنتِ صحیحہ اور دیگر متواتر و قطعی نصوص شریعت کی طرف رجوع کریں گے تو امتِ مسلمہ میں ہر طرح کے اختلاف ختم ہو جائیں اور یہ امت پھر سے ایک جسد و قلب کی مانند متفق و متحد ہو جائے گی،امتِ مسلمہ کے اتحاد کا یہی ایک نسخہ کیمیا ہے۔

جھوٹی روایات کی پہچان اور معیار ردو قبول

مارخ اسلامی کی مدوین جدید کی صرورت

موجودہ حالات میں امتِ مسلمہ کے اختلافات، انتشار اور فرقوں میں تقسیم کو دیکھتے ہوئے ایک معتدل اور امت کا درد رکھنے والا مؤرخ ضرور تاریخِ اسلامی کی تدوین جدید کی آواز اٹھائے گا۔ تاریخ کی تدوینِ جدید کے لیے کیا جانے والے مطالعے کے لیے یا جھوٹی روایتوں کی پہچان، انکا معیار ردوقبول کے لیے درج ذیل نکات زیادہ مفید، موثر اور نتیجہ خیز ثابت ہو سکتے ہیں:

1. جو روایت بھی درایت اور عقل کے خلاف ہو ، یا اصولِ شریعت کے مناقض ہو تو جان لیں کہ وہ روایت موضوع ہے اور اس کے راویوں کا کوئی اعتبار نہیں اسی طرح جو روایت حس اور مشاہدہ کے خلاف ہو ، یا قرآن کریم، سنتِ متواترہ اور اجماعِ قطعی کے مبائن ہو تو وہ روایت بھی قابلِ قبول نہیں۔
2. نہایت اعتدال کے ساتھ ان تمام مؤرخین کی کتابوں سے ثقہ اور جھوٹے و کذّاب راویوں کی روایات میں تمیز کی جائے جنہوں نے اپنی کتابوں میں دونوں طرح کی روایات کو جگہ دی ہے، جیسا کہ خلیفہ بن خیاط، محمد بن سعد ، زبیر بن بکار ، موسی بن عقبہ، وھب بن منبہ ،ابن جریر طبری اور ابن اثیر وغیرہ۔
3. تاریخی روایات کی سند اور متن ہر دو اعتبار سے نقد و تمحیص و تحقیق کے مسلمہ قواعد کی روشنی میں جائزہ لے کر ان پر محتاط و محققانہ کلام کیا جائے۔
4. اس بات میں بھی تفریق ضروری ہے کہ مؤلف اور صاحبِ تاریخ خود تو ثقہ ہیں؛ لیکن اس نے نقل واقعات و روایات میں دروغ گو اور کذّاب راویوں پر اعتماد کیا ہے، جیسا کہ ابن جریر طبری کا حال ہے ، ایسی صورت میں اس مؤرخ کی صرف ثقہ راویوں والی روایات مقبول قرار پائیں گی، دروغ گو و کذّاب رواۃ کی روایات مردود سمجھی جائیں گی۔
5. اگر صاحبِ تاریخ خود کذّاب ودروغ گو ہو تو پھر اس کی کتاب میں موجود ثقہ لوگوں کی روایات بھی غیر معتبر قراردے دی جائیں گی۔
6. اصل ضابطہ تو کذاب راویوں کی روایات کے بارے میں عدمِ قبولیت کا ہے ؛البتہ اگر ان کی کوئی روایت ،قرآنِ کریم، سنتِ مبارکہ اور اجماعِ امت کے مخالف نہ ہو تو دیگر ثقہ راویوں کی روایت کی تائید میں قرائن ومرجحات کی موجودگی میں قبول کرنے کی گنجائش ہوگی۔
7. دینی امور ، صحابۂ کرام ، ائمہ و سلفِ صالحین کے علاوہ دیگر دنیاوی معاملات میں اگر کسی ثقہ راوی کی روایت دستیاب نہ ہو تو بصورت مجبوری دروغ گو راویوں سے منقول روایات نقلِ واقعہ کی غرض سے ذکر کرنے کی گنجائش ہوگی؛مگر اس سے علمِ یقین حاصل نہ ہو گا۔
8. تاریخ اور تحقیق کے نام پر محض مؤرخین کی ذکر کردہ روایات سے اخذ کردہ نتائج بھی غیر مقبول شمار ہوں گے؛ البتہ حقیقی اور مسلمہ اصولوں کے تحت روایت قابل قبول قرار پائے تو اس سے ماخوذ نتائج درست قرار دیے جائیں گے۔
9. صحابہ وائمہ دین کی عیب جوئی سے متعلق روایت قابلِ اعتبار نہیں؛کیوں کہ روایات وضع کرنے والوں میں بعض لوگ وہ ہیں جنہوں نے حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمۂ دین کی برائیاں اور عیب بیان کرنے کے لیے ،یا اپنے دیگر مذموم اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے روایات وضع کی ہیں(اس کا ثبوت ہم گزشتہ تحاریر میں پیش کر چکے) ، ان کا یہ عمل یا تعنت و عناد کی وجہ سے ہے یا تعصب و فساد کی وجہ سے ہے ، پس ان لوگوں کی روایات کا کوئی اعتبار نہیں؛ جب تک کہ ان کی کوئی سند معتمد نہ پائی جائے، یا سلفِ صالحین میں سے کسی نے اس پر اعتماد نہ کیا ہو۔
10. علامہ نووی رحمہ اللہ نے قاضی عیاض اور علامہ مازری رحمھما اللہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ہمیں حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ حسنِ ظن رکھنے اور ہر بری خصلت کی ان سے نفی کا حکم دیا گیا ہے ؛ لہٰذا اگر ان کے بارے میں کسی

روایت میں اعتراض پایا جائے اور اس کی صحیح تاویل کی کوئی گنجائش نہ ہو تو اس صورت میں ہم اس روایت کے راویوں کی طرف جھوٹ کی نسبت کریں گے۔

علامہ عبدالعزیز فرہاروی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس بارے میں اہلِ سنت کا مذہب یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس کی مناسب تاویل کی جائے اور اگر مناسب تاویل ممکن نہ ہو تو اس روایت کو رد کر کے سکوت اختیار کرنا واجب ہے اور طعن کو بالیقین ترک کرنا ہو گا؛ اس لیے کہ حق سبحانہ و تعالی نے تمام صحابۂ کرام سے مغفرت اور جنت کا وعدہ کیا ہے۔

11. تاریخ کی بڑی کتابوں کے اردو تراجم میں عام طور پر راوی کا تذکرہ نہیں کیا گیا اس لیے ان راویوں کی روایتوں کو مضمون سے بھی پہچانا جا سکتا ہے۔ہر تاریخی روایت جس میں صحابہ کی طرف کرپشن، منافقت، زبان درازی، مکاری منسوب کی گئی ہو، وہ زیادہ تر انہی سبائیوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔اس لیے ایسی روایت کو قبول نہیں کیا جانا چاہیے جس سے صحابہ کرام کا کردار مجروح ہو رہا ہو کیونکہ یہ لوگ خود مجروح اور کرپٹ ہیں۔

12. اس پور عمل کے دوران اس بات کا استحضار رہے کہ ہماری تاریخ دروغ گو مکتبۂ فکر کی اغواکاری کا شکار رہی ہے، لہٰذا معمولی سی غفلت بھی موجودہ اور آئندہ آنے والی امتِ مسلمہ کی نسلوں میں تشکیک، تحریف، تضلیل، ائمۂ دین و اسلاف سے بیزاری اور گروہی اختلافات کی آڑ میں ان تاریخی روایات کی بنیاد پر کُشت و خون کی ہولیاں کھیلے جانے کا سبب بن سکتی ہے.

ایک مشہور عالم نے روایات کے معیار ردو قبول کا عوام کے لیے ایک اور بالکل آسان طریقہ لکھا ہے۔

" تاریخ کو قبول کرنے کے لیے مجھے قرآن وحدیث کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، اسکی جو روایتیں قرآن وحدیث کی تعلیم کے مطابق ہونگی میں انہیں بڑی محبت سے قبول کروں گا اور جو روایتیں، حکایتیں، رذالتیں، قباحتیں قرآن وحدیث سے ٹکرائیں گی میں انہیں نہ صرف رد کروں گا بلکہ اپنے پاؤں میں مسلوں گا، کیونکہ وہ تاریخ نہیں جھوٹ ہے، تہمت ہے، بہتان اور دشنام ہے اور انسانیت سے گری ہوئی باتیں ہیں، تاریخ کے حوالے دے کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم پر تبراہ کرنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس سے تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی بھی محفوظ نہیں ہے. کیا اس سے بہتر نہیں کہ تاریخ کی اندھی (سبائی) عینک سے اصحاب مصطفی کی عیب چینیوں کی بجائے قرآن وحدیث سے انکی فضیلتوں اور قدرومنزلت پر نگاہ کی جائے۔(اگر یہ لوگ قرآن وحدیث کی اصحاب کے بارے میں دی گئی شہادتوں کو پس پشت ڈال کر محض تاریخی روایتوں کے ذریعے ان پر نکتہ چینی جاری رکھتے ہیں تو) ایسے نام نہاد 'تاریخ دان' ہمارے نزدیک 'تھوک دان' کے برابر بھی اہمیت نہیں رکھتے"۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔

اسلامی ذخائر کتب میں غیر اسلامی نظریات کی ملاوٹ پر ایک تحقیق

اسماعیلیہ / قرامطہ / باطنیہ

حضرت جعفر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد شیعہ کے دو گروہ پیدا ہوئے۔ جس نے ان کے چھوٹے بیٹے حضرت موسی کاظم کو ان کا جانشین تسلیم کیا وہ آگے چل کر امامیہ اثنا عشریہ کے نام سے مشہور ہوا۔ جنہوں نے ان کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل کو ان کا جانشین تسلیم کیا وہ آگے چل کر اسمعیلیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ اگرچہ شیعت ہی کی شاخ تھی لیکن بعد میں یہ تحریک اپنے معتقدات اور اعمال کے لحاظ سے شیعت سے بھی کوسوں دور نکلگئی، تاریخ میں اسے ملاحدہ، باطنیہ، تعلیمیہ اور قرامطہ جیسے القاب سے یاد کیا گیا۔ حمدان قرمط ایک عراقی کاشتکار تھا، چونکہ اس کی ٹانگیں چھوٹیں تھیں اس لیے اسے قرمط کہتے تھے۔ اس نے اسمعیلی مذہب کو باطنی تحریک میں تبدیل کر دیا، اسی کے نام سے اسماعیلی فرقہ قرامطہ کے نام سے موسوم ہو گیا۔

شروع میں یہ مسلح تحریک کے طور پر سامنے آئے اور عرصے تک قتل وغارت کا بازار گرم رکھا۔ سنہ ۳۱۳ھ میں قرامطہ کے خوف سے کسی نے حج نہیں کیا، اس قدر شدت پسند، لڑاکے اور جنگجو تھے کہ ایک سال حج کے موقع پر بیت اللہ شریف سے حجر اسود کو اُٹھا کر لے گئے اور بیس برس تک حجر اسود انکے قبضہ میں رہا۔

عباسی خلیفہ نے انکی سرکوبی شروع کی اور مصر، بحرین عراق وشام وغیرہ پر عرصے سے چلے آنے والی انکی حکومتیں برباد ہو گئیں، اس کے بعد قرامطہ کے عقائد واعمال میں ایک خاص تبدیلی پیدا ہوئی، انہوں نے خفیہ طور پر اپنی انجمنیں قائم کیں اور اُن خفیہ جماعتوں کے ذریعہ انہوں نے اپنی تبلیغ اور اپنی جماعت کے ترقی دینے کا سلسلہ جاری کیا، جابجا اپنے داعی مقرر کر دیئے، ان داعیوں کی جماعت اپنے رازوں کو بہت محفوظ رکھتی تھی زاہدوں اور پیروں کے لباس میں یہ لوگ نظر آتے اور لوگوں کو اپنا مرید بناتے پھرتے تھے۔

مصر کے عبیدی بادشاہ نے ان کی سرپرستی اور ہر قسم کی امداد کی، ان کے ذریعے سلطنت اسلامیہ کی بربادی کے لئے عبیدیوں نے اسلامی ممالک میں قرامطہ کے داعیوں کا ایک جال غیر محسوس طریقہ پر پھیلا دیا تھا، چونکہ یہ لوگ ایک مٹی ہوئی سلطنت کے سوگوار تھے، اس لئے موقعہ پاتے ہی یہی داعی یا پیر اپنے رفیقوں یعنی خاص مریدوں کے مدد سے رہزنوں اور ڈاکوؤں کے لباس میں بھی تبدیل ہو جاتے تھے، چونکہ ان کی کماحقہ، سرکوبی ابتدا میں نہ ہو سکی اس لئے

ان کی قوت بہت بڑھ گئی تھی، مسلمان سرداروں کو چھپ چھپ کر قتل کرنا اُنہوں نے اپنا خاص شیوہ بنالیا تھا، جس جگہ کوئی حاکم نہایت چست اور چو ہوتا وہاں یہ بالکل خاموش اور روپوش رہتے، لیکن جس جگہ انتظام سلطنت کو کسی قدر کمزور پاتے وہاں قتل وغارت کے ہنگاموں سے قیامت برپا کر دیتے، یہ خفیہ طور پر اپنا کام کرتے تھے اس لئے ان کو باطینہ کے نام سے مشہور ہوئے، بعد میں ان باطیوں نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے اصفہان کے قلعہ شاہور پر قبضہ کر لیا.

ان کے جس لیڈر کو سب سے زیادہ شہرت ملی وہ حسن بن صباح تھا، حسن بن صباح کا صحیح نام ونسب حسن بن علی بن احمد بن جعفر بن حسن بن صباح الحمیری تھا۔ اس نے قلعہ الموت میں اپنی سلطنت قائم کرر کھی تھی؛ اس کے پیروکار حشیشیں کہلاتے، حشیش کا نشہ ان کی زندگی کا لازمہ تھا،

سلجوقیوں کی خانہ جنگی اور ضعف واختلال نے ان باطسوں کی حکومت کو مستقل وپائدار ہونے کا موقعہ دیا، جس کو بعد میں فدائیوں کی سلطنت، سلطنتِ اسمعیلیہ، سلطنت حشاشین وغیرہ ناموں سے یاد کیا گیا، حسن بن صباح جس طرح اس سلطنت وحکومت کا بانی تھا، اسی طرح وہ اپنے فرقہ اور مذہب کا بھی بانی سمجھا گیا، اُس نے عام باطسوں کے برعکس بعض نئے طریقے اعمال وعبادات میں ایجاد کئے، اُس کے تمام مریدین اُس کو سیدنا کہتے تھے، عام طور پر وہ شیخ الجبل کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، وہ ۳۵ سال قلعہ الموت پر قابض وحکمراں رہا۔

اس نے فدائیوں کا ایک گروہ تیار کیا ہوا تھا، جو اس کے اشارے پر جان دینا اپنا مقصد زندگی سمجھتے تھے، حسن دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں، وزیروں، عالموں کو حسن بن صباح قلعہ الموت میں بیٹھا ہوا اپنے فدائیوں کے ہاتھ سے قتل کرا دیتا تھا، اس طرح اُس کی دھاک دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی اور بڑے بڑے بادشاہ اپنے محلوں اور دارالحکومتوں میں اطمینان کے ساتھ نہیں سوسکتے تھے،

اسکے فدائیوں کے ہاتھ سے جو لوگ قتل ہوئے اُن میں خواجہ نظام الملک طوسی، وزیر اعظم سلطان الپ ارسلان وملک شاہ سلجوقی، فخر الملک بن خواجہ نظام الملک، شمس تبریزی، مولانا رومی، نظام الملک معود بن علی وزیر خوارزم شاہ، سلطان شہاب الدین غوری اور بعض عیسائی سلاطین یورپ خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں، سلطان صلاح الدین ایوبی اور حضرت امام فخر الدین رازی کو بھی ملاحدہ نے قتل کی دھمکی دی تھی مگر وہ بچ گئے۔

انکی حکومت سنہ ۴۸۳ھ سے سنہ ۶۵۵ھ تک پونے دو سو سال تک قائم رہی، پہلے جلال الدین بن علاء الدین خوارزم شاہ نے ان پر چڑھائی کر کے ان کے زور وقوت کو توڑا اور قلعہ الموت میں ان کو محصور کر کے تمام دوسرے قلعوں کو اُن سے چھین کر ویران ومنہدم کر دیا، رہی سہی کسر ہلاکو خان نے آکر نکال دی۔ سلطنت کے برباد ہونے کے بعد قرامطہ نے دوبارہ زاہدوں اور پیروں کا لباس اوڑھا اور دور علاقوں ہندوستان وغیرہ کی طرف نقل مکانی کر گئے۔

اس باطنیہ اسمٰعیلیہ فرقہ نے جہاں ایک طویل عرصے تک ملت اسلامیہ کو جانی ومالی نقصان پہنچایا وہیں اپنے باطل نظریات کو بھی بالواسطہ طور پر عامۃ المسلمین کے مختلف طبقات وعناصر میں پوری قوت کے ساتھ پیوست کرنے کی اپنی شیطانی کوشش میں کوئی کسر نہ چھوڑی، چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کے تہذیب، تمدن، معیشت، سیاست، معاشرت، عبادات، تفسیر، احادیث، اسلامی علوم وفنون غرض ہر شعبہ زندگی میں اپنا اثر ڈالا۔

انہوں نے اپنی عیاری اور معاندانہ سرگرمیوں سے اسلامی کتابوں میں جو گمراہ کن تدسیس (اپنی باتوں کو دوسروں کی باتوں میں ملا کر چھپانا) کرنے کی کوشش کی، اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے، مگر ہم مضمون کو طوالت سے بچانے کے صرف چند بڑی مثالوں پر اکتفا کریں گے۔

قرآن میں تدسیس کی کوششیں:

قرآن کی حفاظت کے لیے حضرات صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں یہ سلسلہ رہا کہ ایک ہی شخص حافظ قرآن، مفسر قرآن اور علم قراءت کا ماہر ہوتا تھا۔ پھر جیسے جیسے صلاحیتوں میں کمزوری آتی گئی ویسے ویسے حفاظت قرآن کی خدمت امت مسلمہ کے مختلف طبقوں میں تقسیم ہوتی گئی۔

چناں چہ حضرات علمائے مفسرین نے قرآن کریم کے معانی و مطالب، تفسیر و تشریح اور مراد خداوندی کی حفاظت فرمائی۔ حضرات قراء و مجودین نے اس کی مختلف قراءت، ادائیگی حروف اور مخارج وصفات کی حفاظت کی اور حضرات حفاظ نے اس کے الفاظ کو اپنے سینوں میں محفوظ کر کے یہ خدمت انجام دی ۔ یوں متن کی حفاظت، معنی و مفہوم کی حفاظت، زبان کی حفاظت، الفاظ و معانی کی عملی صورت کی حفاظت، شانِ نزول کی حفاظت، سیرت نبوی کی حفاظت ، قرآن کے اولین مخاطب کے حالات کی حفاظت، تابعین کے حالات کی حفاظت وغیرہ وہ چیزیں ہیں جن کو قرآن کی حفاظت کی خاطر اللہ رب العزت نے حیرت انگیز انداز میں تحفظ بخشا، اور اپنی کامل قدرت کا مظاہرہ کیا۔

دشمنان اسلام نے اپنے تمام وسائل و طریقے استعمال کرنے کے بعد یہ جان لیا کہ اللہ کی اس کتاب میں وہ لوگ کسی طرح کی لفظی تبدیلی نہیں کر سکتے، پھر انہوں نے قران کے فہم میں معنوی تحریف کا راستہ اپنایا اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب رہے، اور ہیں۔

باطنیہ نے قرآن کی باطنی تفسیر کو اپنے پیروں، جوگیوں کے ذریعے رواج دیا، وہ یہ کہتے ہی قرآنی نصوص کے باطنی معانی بھی ہیں جن کو 'مرشد' کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس سے مقصود ان کا یہ ہے کہ شریعت کو بالکلیہ معطل کر دیا جائے"۔

تفسیر باطنی دراصل "تحریف الکلم عن مواصعہ" کی ہی ایک صورت ہے یعنی کلمات کو ان کے اصل مواضع سے ہٹا دینا اور یوں شرعی دلائل کو اپنی اصل حیثیت اور دلالت سے محروم کر دینا۔

باطنیوں کی کچھ فاسد تاویلات ملاحظہ فرمائیں:

وورث سلیمان داؤد (النحل:16) "سلیمان علیہ السلام نے داؤد علیہ السلام کی وراثت پائی" کہتے ہیں (سلیمان اور داؤد رمز یہ بیان ہوئے) مراد ہے امام علی رضی اللہ تعالی عنہ کا نبی کا وارث بننا۔

" طہارت حاصل کرنے' سے مراد ہے 'امام معصوم' کی پیروی کے ماسوا ہر مذہب سے براءت کر لینا!

'تیمم' سے مراد ہے امام کے شہود تک رخصتیں اختیار کئے رکھنا!

'روزہ' یہ ہے کہ آدمی راز کو قابو کئے رہے!

'کعبہ' سے مراد ہیں: نبی اور بابِ کعبہ: علی رضی اللہ تعالی عنہ!

اسی طرح قرآن میں 'صفا' سے مراد ہیں: نبی اور مروہ سے: علی رضی اللہ تعالی عنہ۔

یوں آدمی کو نبی اور علی رضی اللہ تعالی عنہ کے مابین سعی کرتے رہنا ہے!

'آتش نمرود' سے مراد ہے نمرود کا قہر و غضب، جس کی ابراہیم علیہ السلام نے پرواہ نہ کی!

عصائے موسی علیہ السلام سے مراد ہے موسی علیہ السلام کی قوتِ دلیل و حجت!

یہ ہیں چند مثالیں ان خرافات کی جو باطنی تفسیر کے تحت کی جاتی ہیں اور جو نہ عقل کی رو سے قابل قبول ہیں اور نہ نقل کی رو سے۔ یہ حقیقت میں قرآن اور

سنت کو ایک شدید انار کی سے دوچار کر دینے کی ایک کوشش تھی کہ شریعت کے الفاظ کو کوئی جو معنی چاہے پہنالے اور یہ کہ شریعت کے کسی لفظ کا کسی دن کچھ بھی مطلب نکل آئے! شریعت گویا معاذ اللہ ایک مہمل کلام ہے۔ کچھ بھی بول کر کچھ بھی مراد لی جاسکتی ہے اس کے لئے کوئی بھی قاعدہ ضابطہ نہیں!

مزید یہ کہ لوگ ایک دوسرے کا سر پھوڑتے پھریں اور ہر آدمی یہ دعویٰ کرے کہ 'دوسرے' قرآن کا مطلب ہی نہیں سمجھ پائے!

آج کے دور میں قرآن میں تحریف کا ایک طریقہ رائج کیا گیا ہے وہ یہ کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے اپنی عقل، رائے، منطق اور فلسفہ کا استعمال۔ اُمت مسلمہ کے ہر کس وناکس کو بظاہر قران کا محب اور قران پر عمل پیرا ہونے کے زعم میں مبتلا کر کے یہ کج روی سجھائی گئی ہے کہ احادیث کو چھوڑ کر اپنی سوچ وفکر کی بناپر قرآن کو سمجھے اور سمجھائے، چنانچہ آج ہم ایسے کئی لوگوں کو دیکھتے ہیں جو قران کریم میں مذکور اللہ تبارک وتعالی کے الفاظ مبارک میں سے چند ایک کے بھی لفظی ولغوی معانی نہیں جانتے چہ جائیکہ ان کے احکام اور اللہ کی مراد جانتے ہوں' وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کی احادیث مبارکہ کو رد کرتے ہیں، اور قران کی معنوی تحریف کرتے ہیں۔

احادیث میں تدسیس کی کوششیں :۔

باطنیہ نے قرآن کے بعد د احادیث میں تدسیس کے لیے بھی کوششیں کیں، چنانچہ ملا علی قاری کے ایک قول کے مطابق باطنیہ نے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل میں تین لاکھ کے قریب روایات گھڑ کے پھیلائی ہیں۔ کچھ گھڑی گئی روایتوں کی مثالیں پیش خدمت ہیں جنہیں قرامطہ نے ذخیرہ احادیث میں داخل کرنے کی کوشش کی اور علمانے انکی کوششوں کو ناکام بنادیا۔

روایت "انا مدینۃ العلم "یا" انا دار الحکمۃ وعلی بابھا":۔

قرامطہ اور ان کے ہم خیالوں نے اس قدر جسارت کی کہ اپنے مزعوماتِ باطلہ احادیث نبوی کے لباس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کیے، منجملہ ان کے یہ حدیث ہے جو ترمذی میں بھی موجود ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "أنا دار الحکمۃ وعلي بابھا". رواہ الترمذي

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: میں حکمت ودانائی کا گھر ہوں اور علی اس گھر کا دروازہ ہیں"

مشہور محدث مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ اپنے مکتوب میں صفحہ ۷۵، ۱۸۰، ۱۷۹ پر تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ روایت نہ تو صحیحین میں ہے اور نہ روایت کا ذکر کرنیوالے اس کی تصحیح فرماتے ہیں۔ ترمذی نے بھی روایت کے بعد کلام کیا ہے کہ بعض علمانے یہ حدیث شریک تابعی سے روایت کی ہے مگر علمائے حدیث اس کو ثقات میں سے نہیں پہچانتے۔ سوائے شریک کے علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے موضوعات میں اس کے جملہ طرق پر یقین کے ساتھ باطل ہونے کا حکم دیا ہے۔ ایک جماعت محدثین کی اس کے موضوع ہونے کی قائل ہے۔ امام الجرح والتعدیل یحیی بن معین رحمہ اللہ صاف فرماتے ہیں کہ اس روایت کی سرے سے کوئی اصل نہیں ہے۔ طاہر پٹنی نے بھی اس کی صحت کا انکار کیا ہے۔۔۔ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری بھی روایت کی صحت کو تسلیم نہیں فرماتے"۔

(مکتوبات شیخ الاسلام حصہ اول، اردو بک سٹال لاہور) (حاشیہ از مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی مرتب مکتوبات شیخ الاسلام)۔

نادِ علی کی روایت:۔

قرامطہ کے سلسلے میں یہ روایت بہت مقبول ہے اور کم علم صوفیا کے ہاں بھی نقل ہوتی آرہی ہے۔ جب جنگ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوگئے اور جسم سے خون بہنے لگا تو جبریل نے آکر آپ سے کہا کہ نادِ علیاؑ والی دعا پڑھو یعنی علی کو پکارو، جب آپ نے یہ دعا پڑھی تو علی رضی اللہ عنہ فوراً آپ کی مدد کے لئے آئے اور کفار کو قتل کر کے آپ کو اور تمام مسلمانوں کو قتل ہونے سے بچالیا۔

(درویشوں کا بیکاشی سلسلہ مصنفہ ڈاکٹر برج صفحہ ۱۳۸)

اہل علم جانتے ہیں کہ حضور نے ایسی کوئی دعا نہیں پڑھی اور نہ تاریخ یا سیرت کی کسی کتاب میں یہ دعا مرقوم ہے، پھر بھی یہ روایت اہل سنت کی کتابوں میں راہ پاگئی اور ایک سنی صوفی سید مظفر علی شاہ چشتی نے اپنی کتاب جواہر غیبی میں اسے ذکر کیا۔

اس کے علاوہ بھی بہت سی گھڑی ہوئی احادیث ہے جن کی ہمارے علما نے تحقیق کے بعد نشاندہی کی ہے لیکن یہ روایات پھر بھی اس تحقیق سے لاعلم لوگوں کی تحریرات میں نقل ہوتی آرہی ہیں۔

حدیث چونکہ وحی کی ایک قسم تھی اس لیے اللہ نے اس کی حفاظت کا بھی ایک نظام بنایا۔ جھوٹی احادیث وضع کرنے کا سلسلہ صحابہ کے دور سے سبائیوں نے شروع کر دیا تھا اس لیے اہل علم صحابہ کرام نے روایت کو قبول کرنے کے لئے تحقیق کو لازم قرار دیا اور حدیث کے قبول کرنے کا ایک معیار مقرر کیا تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف من گھڑت بات منسوب نہ ہو جائے۔ بعد میں باقاعدہ علم حدیث میں اسناد و متن کی تحقیق کے اصول مرتب ہوئے اور اسماء الرجال اور جرح و تعدیل کا باقائدہ ایک فن وجود میں آیا جس سے چودہ سو سال بعد بھی ہر حدیث کی سند اور متن کی تحقیق باآسانی ہو جاتی ہے۔

خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں ایک زندیق کو قتل کے لیے لایا گیا، وہ کہنے لگا کہ تم مجھے تو قتل کر دوں گے لیکن ان ایک ہزار حدیثوں کا کیا کرو گے جو میں نے وضع کر کے چالو کر دی ہیں، ہارون الرشید نے فوراً جواب دیا:

اے دشمن خدا! تو ابو اسحق فزاری اور ابن مبارک سے بچ کر کہاں جا سکتا ہے وہ ان کو چھلنی کی طرح چھان کر ایک ایک حروف نکال پھینکیں گے۔

(علوم الحدیث 32)

تاریخ اسلام میں ملاوٹ کی کوششیں

قرامطہ نے قرآن و حدیث کے بعد تاریخ اسلام کو خصوصی طور پر تدسیس و تحریف کا ہدف بنایا اور اسکا خاص مقصد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہ کی تنقیص و توہین و تحقیر تھی۔ سیرۃ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ مولفہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ سے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ مولانا لکھتے ہیں:۔

"بعض شیعہ مورخوں نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کچھ سپاہیوں کے ساتھ ایک سپید خچر پر سوار ہو کر امام حسن رضی اللہ عنہ کے جنازے کو روکنے کے لیے نکلیں، یہ روایت تاریخ طبری کے ایک پرانے (نسخے) فارسی ترجمے میں، جو ہندوستان میں بھی چھپ گیا ہے، میں نظر سے گذری، لیکن جب اصل متن عربی مطبوعہ یورپ کی طرف رجوع کیا تو جلد ہفتم کا ایک ایک لفظ پڑھنے کے بعد بھی یہ واقعہ نہ ملا، طبری کے اس فارسی ترجمہ میں درحقیقت

بہت سے حذف واضافے ہیں"۔

اسی طرح تاریخ میں سینکڑوں روایات گھڑی ہوئی موجود ہیں، کچھ کے متعلق ہم پہلے بھی تحقیق پیش کر چکے۔ تاریخ کا موضوع تھا ہی ایسا کہ اس میں ہر بات میں اپنی پسند ناپسند اور سمجھ بوجھ کو بیان کرنے کی پوری آزادی تھی اس لیے اس میں تمام رطب ویابس اور صحیح وسقیم چیزیں جمع کی جاتی رہیں' ہر کسی نے اپنی سمجھ کے مطابق تاریخ کو بیان کیا۔ چنانچہ صحت کا جو معیار "حدیث" میں قائم رکھا گیا' تاریخ میں وہ معیار قائم نہیں رہ سکا' نہ اسے قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے' اس لئے حضرات محدثین نے متنازعہ واقعات کی روایات کی صحت کی ذمہ داری اٹھانے سے انکار کر دیا ہے' حافظ عراقی فرماتے ہیں:(علم تاریخ وسیر صحیح اور منکر سب کو جمع کر لیتا ہے)۔

ولیعلم الطالب ان السیر

یجمع ما قد صح وما قد انکرا

اب جو شخص کسی خاص مدعا کو ثابت کرنے کے لئے تاریخی مواد کو کھنگال کر تاریخی روایات سے استدلال کرنا چاہتا ہے اسے عقل وشرع کے تمام تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف یہ دیکھ لینا کافی نہیں ہے کہ یہ روایت فلاں فلاں تاریخ میں لکھی ہے' بلکہ جس طرح وہ یہ سوچتا ہے کہ یہ روایت اس کے مقصد ومدعا کے لئے مفید ہے یا نہیں؟ اسی طرح اسے اس پر بھی غور کر لینا چاہئے کہ کیا یہ روایت شریعت یا عقل سے متصادم تو نہیں؟

قرآنِ کریم کی نصوصِ قطعیہ' احادیثِ ثابتہ اور اہل حق کا اجماع صحابہ کی عیب چینی کی ممانعت پر متفق ہیں' ان قطعیات کے مقابلہ میں تاریخی قصہ کہانیوں کا سرے سے کوئی وزن ہی نہیں' رسول اللہ کا یہ ارشاد یاد رکھیں۔

"اذا رایتم الذین یسبون اصحابی فقولوا لعنہ اللہ علی شرکم" (ترمذی

ترجمہ:" جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہ کو برا بھلا کہہ رہے ہوں تو ان سے کہنا کہ تمہارے اس شر اور فتنہ پروری پر اللہ کی لعنت ہو۔

(ترمذی، مشکوٰۃ)

اسلاف امت، اکابر علما، اولیا سے منسوب کی گئی کتابیں

امام عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ الیواقیت والجواہر صفحہ ۷ میں لکھتے ہیں

"باطنیہ، ملاحطہ اور زنداقہ نے سب سے پہلے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ پھر امام غزالی رحمہ اللہ کی تصانیف میں اپنی طرف سے تدسیس کی، نیز اس فرقہ باطنیہ نے ایک کتاب جس میں اپنے عقائد کی تبلیغ کی تھی، میری زندگی میں میری طرف منسوب کر دی اور میری انتہائی کوشش کے باوجود یہ کتاب تین سال تک متداول رہی"

(الیواقیت والجواہر صفحہ ۷)

حضرت فریدالدین عطار نیشاپوری رحمہ اللہ سے منسوب کتابیں:۔

شیخ عطار سنی عالم اور سلسلہ کبیرویہ سے متعلق تھے اور شیخ نجم الدین کبری کے معتقد تھے، ان سے بائیس کتابیں منسوب ہیں حالانکہ وہ صرف دس کتابوں کے مصنف تھے۔ ان سے منسوب کتابوں میں بڑی کتابیں جواہر الذات، حلاج نامہ، لسان الغیب وغیرہ ہیں، ان کتابوں میں مصنف نے جگہ جگہ اظہار تشیع

کیاہے۔ مشہور ایرانی محقق پروفیسر سعید نفیسی نے بھی فرید الدین عطار کی زندگی اور کتابوں پر تحقیق "جستجو در احوال و آثارِ فرید الدین عطار نیشاپوری" میں پیش کی ہے۔ ہم نسخہ جواہر الذات سے دو شعر پیش کرتے ہیں جن سے پوری کتاب کا اندازہ ہو جائے گا اور یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ شعر شیخ فرید الدین عطار نیشاپوری رحمہ اللہ اپنے قلم سے ہر گز نہیں لکھ سکتے تھے۔

محمد را شناس ایں جا خدا تو و گرنہ او فتی اندر بلا تو

علی با مصطفی ہر دو خدا یند کہ دم دم را ز بر ما می کشانید

ان شعروں کے مضمون سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے کہنے والا عبد اللہ ابن سبا کا مخلص پیرو اور باطنیہ یا قرامطہ سے تعلق رکھتا تھا۔

امام غزالی سے منسوب ایک کتاب:۔

مولانا سعید احمد جلالپوری شہید جو کہ روزنامہ جنگ کے اقرا صفحہ پر اسلامی سوالات کا جواب دیتے تھے کو ایک ڈاکٹر صاحب نے اپنے سوالہ نامہ میں یہ تحریر بھیجی جس میں شیعی موقف کو امام غزالی رحمہ اللہ علیہ کی کتاب کے ذریعے ان سے منسوب کیا گیا تھا کہ امام غزالی رحمہ اللہ اپنی کتاب "سر العالمین" کے صفحہ :۹ پر لکھتے ہیں کہ:

" غدیر خم میں حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے "من کنت مولاہ" فرمانے کے بعد اور اس موقع پر مبارک باد دینے کے بعد جب لوگوں پر خلافت کی ہوا و ہوس غالب آگئی تو انہوں نے غدیر خم کی تمام باتیں بھلا دیں۔"

اس پر مولانا سعید احمد جلالپوری رحمہ اللہ نے ایک تحقیقی، تفصیلی و وقیع علمی مقالہ لکھا جو ماہنامہ بینات میں چھپا۔ مولانا نے تحقیق کے لئے اکابر متأخرین اور اربابِ تحقیق کی کتابوں کی طرف رجوع کیا تو پتا چلا کہ غدیر خم میں خلافتِ علی رضی اللہ عنہ (بلا فصل) سے متعلق امام غزالی رحمہ اللہ کی جانب منسوب یہ کتاب "سر العالمین" سرے سے امام صاحب کی ہے ہی نہیں اور روافض نے خود لکھ کر بعد میں ان سے منسوب کی۔ یہ بات امام صاحب پر جھوٹ اور بہتانِ عظیم ہے اور امام رحمہ اللہ کی دوسری کتابیں اس تحریر کے موقف کو بری طرح رد کرتیں ہیں۔ مولانا نے اس سلسلہ میں مسند الہند حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی شہرہ آفاق تصنیف "تحفہ اثنا عشریہ" کا حوالہ بھی دیا۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"روافض کوئی کتاب لکھ کر اس کو اکابر اہل سنت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، اور اس میں حضرات صحابہ کرام کے خلاف مطاعن اور مذہب اہل سنت کے بطلان کو درج کرتے ہیں اور اس کے خطبہ یا دیباچہ میں اپنے بھید اور راز کے چھپانے اور امانت کی حفاظت کی وصیت کرتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ اس کتاب میں لکھا ہے، یہی ہمارا دلی اور پوشیدہ عقیدہ ہے، اور ہم نے اپنی دوسری کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ محض پردہ داری اور زمانہ سازی تھا، جیسا کہ کتاب "سر العالمین" خود سے لکھ کر انہوں نے اس کی نسبت حضرت امام غزالی رحمہ اللہ کی طرف کر دی ہے، علیٰ ہذا القیاس انہوں بھی بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں اور ان پر اکابر اہل سنت اور قابل اعتماد بزرگوں کا نام لکھ دیا ہے، ظاہر ہے کہ ایسے افراد بہت کم ہیں جو کسی بزرگ کے کلام سے واقف و آشنا ہوں اور اس کے مذاق سخن یا اس کے اور دوسروں کے کلام میں فرق و امتیاز کر سکتے ہوں، لہٰذا ناچار سیدھے سادے لوگ ان کے اس مکر سے متاثر ہوتے ہیں اور بہت سے حیران و پریشان ہوتے ہیں.... بلکہ بہت سے لوگ اس کو ایک مستند بزرگ یا اہل سنت کے امام کا کلام سمجھ کر اس کو اپنا کر اپنا ایمان و عقیدہ غارت کرتے ہیں....۔" (تحفہ اثنا عشریہ فارسی، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی متوفیٰ ۱۲۳۹ھ)

مولانا جلالپوری شہید کا وہ مقالہ جامعہ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن، کراچی کی سائیٹ پر یہاں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

node/971/http://banuri.edu.pk/ur

اسلامی تصوف میں ملاوٹ کی کوششیں

اکابر اولیا اور صوفیاء کے ملفوظات میں تدسیس کی کوششیں:

جس زمانہ میں قرامطہ نے اپنی تبلیغی سرگرمیاں شروع کیں، مسلمانوں میں تصوف کا آغاز ہو چکا تھا اور مختلف سلسلے قائم ہو چکے تھے۔ قرامطہ نے تقیہ کرتے ہوئے "جیسا دیس ویسا بھیس" کے اصول پر عمل کیا اور صوفیوں کے حلقوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو صوفی ظاہر کیا اور تصوف کے لباس میں صوفیوں کو گمراہ کرنا شروع کیا اور اسلامی تصوف میں غیر اسلامی عقائد کی اس طرح آمیزش کی کہ اسلامی اور غیر اسلامی تصوف میں امتیاز عوام کے لیے ناممکن ہو گیا۔

رومی کے ملفوظات میں الحاق:۔

رومی کے ملفوظات فیہ مافیہ سے صفحہ نمبر ۹۹ پر یہ رومی سے منسوب روایت، پڑھیے سر دھنیے:

"ایک شب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ کسی غزوے سے واپس آئے تو آپ نے فرمایا: ببانگ دہل اعلان کر دو کہ آج کی رات ہم شہر کے دروازے کے پاس بسر کریں گے اور کل صبح شہر میں داخل ہوں گے، یہ سن کر صحابہ نے سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ ہو سکتا ہے کہ تم اجنبی لوگوں کو اپنی بیویوں کے ساتھ مباشرت میں مشغول پاؤ اور یہ دیکھ کر تمہیں بہت صدمہ ہو گا اور ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا، لیکن ایک صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر عمل نہ کیا اور گھر چلا گیا، چنانچہ اس نے اپنی بیوی کو ایک غیر مرد کے ساتھ مشغول پایا"۔

اس لغو روایت پر تنقید کرنے کو دل نہیں چاہتا تاہم دل پر جبر کر کے اتنا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ روایت کسی سبائی کے اسی خبث باطنی کا مظہر ہے جو وہ صحابہ رضوان اللہ کے بارے میں کرتے آرہے ہیں۔ غور کریں اس خبیث سبائی نے ایک تیر سے کتنے شکار کیے ہیں۔

1- حضور کو علم غیب سے معلوم ہو چکا تھا کہ صحابہ کی بیویاں نعوذ باللہ زنا کروا رہی ہیں لیکن آپ نے جان بوجھ کر چشم پوشی کی، اور اس زنا کو روکنے سے صحابہ کو منع کیا۔ نعوذ باللہ

2- بعض صحابہ حضور کے نافرمان تھے، حضور کے منع کرنے کے باجود نہیں سنی اور گھر چلے گئے۔ نعوذ باللہ

3- صحابہ کی بیویاں زناکار تھیں۔ نعوذ باللہ

کیا مولانا روم یہ روایت بیان کر سکتے ہیں؟

امام شعرانی کی تصنیف الطبقات الکبری:۔

اس کتاب کے اردو ترجمہ صفحہ 468 پر روایت ہے:

بصمس ظاہر و باطن عارف۔ علی ابن ابی طالب اسی طرح اٹھائے گئے ہیں جس طرح عیسی اور عیسی کی طرح عنقریب نازل ہوں گے۔ میں کہتا ہوں کہ سید علی خواص بھی اس کے قائل تھے۔ چنانچہ میں نے ان کو کہتے سنا کہ نوح نے کشتی میں سے ایک تختہ علی کے نام اٹھا کر رکھا، وہ تختہ محفوظ رہا، چنانچہ علی اسی تختہ پر اٹھائے گئے۔

اس روایت کا مضمون بتا رہا ہے کہ یہ کسی ایسے شخص کی گھڑی ہوئی ہے جو حضرت علی رضی اللہ کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کا عقیدہ رکھتا تھا اور تاریخ و تحقیق سے ثابت ہے کہ یہ عقیدہ امام شعرانی کا بالکل نہیں بلکہ یہ سب سے پہلے عبد اللہ ابن سبا نے شائع کیا تھا۔

رباعی از خواجہ معین الدین اجمیری رحمہ اللہ:۔

قرامطہ نے فصوص الحکم، فتوحات مکیہ، مثنوی مولانا روم، احیاء العلوم اور دوسری بہت سی کتابوں میں عبارتیں اور اشعار داخل کیے اور بہت سی کتابیں خود لکھ کر بعض سنی بزرگوں کے نام منسوب کیں، بہت سی رباعیات مختلف صوفیوں سے منسوب کر دیں، مثلا یہ مشہور رباعی خواجہ معین الدین اجمیری رحمہ اللہ سے منسوب کی جو آج تک سنی اور کتابوں میں بھی نقل ہوتی چلی آرہی ہے۔

شاہ است حسین بادشاہ ہست حسین　　دین است حسین　　دیں پناہ ہست حسین

سرداد نداو　دست در دست یزید　　حقا کہ بنائے　لا　الہ　ہست حسین

شیخ محی الدین ابن عربی کی فتوحات مکیہ:۔

شیخ جیسا کہ فتوحات مکیہ کے مطالعے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ نہایت راسخ العقیدہ اور متبع شریعت بزرگ تھے، اسی کتاب کی پہلی فصل میں انہوں نے اپنا عقیدہ بیان کیا ہے اسے غور سے پڑھا جائے تو معلوم ہو گا کہ عقائد نسفی کی شرح پڑھ رہے ہیں۔ انکی تصانیف میں بھی سبائیہ قرامطہ نے تدسیس کی۔

چنانچہ امام شعرانی اپنی تصنیف الیواقیت والجواہر صفحہ 7 پر لکھتے ہیں:

"انکی تصنیف میں جو عبارتیں ظاہر شریعت سے متعارض (ٹکرانے والی) ہیں وہ سب مدسوس (گھسائی ہوئی) ہیں۔ مجھے اس حقیقت سے ابو طاہر المغربی نے آگاہ کیا جو اس وقت مکہ معظمہ میں مقیم تھے۔ انہوں نے مجھے فتوحات کا وہ نسخہ دکھایا جس کا مقابلہ انہوں نے قونیہ میں شیخ اکبر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے سے کیا تھا، اس نسخے میں وہ فقرے نہیں تھے جو میرے نسخے میں تھے اور میں نے ان فقروں کی صحت پر شک کیا تھا جب میں فتوحات کا اختصار کر رہا تھا۔"

پھر لکھتے ہیں کہ زناوقہ نے امام احمد بن حنبل کے مرض الموت کے زمانے میں ایک کتاب جس میں اپنے باطنی عقائد بیان کیے تھے، پوشیدہ طور پر (ان کا شاگرد بن کر) ان کے سرہانے تکیے کے نیچے رکھ دی تھی اور اگر امام مرحوم کے تلامذہ ان کے عقائد سے بخوبی واقف نہ ہوتے تو جو کچھ انہوں نے تکیے کے نیچے پایا تھا اسکی وجہ سے وہ لوگ بہت بڑے فتنے میں مبتلا ہو جاتے۔

دیوان شمس تبریز:۔

قرامطہ نے بہت سے اشعار مولانا رومی کی کتابوں میں داخل کئے، دیوان شمس تبریز میں داخل کی گئی ایک پوری غزل سے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

ہم اول و ہم آخر و ہم ظاہر و باطن　　ہم موعد و ہم وعدہ و موعود علی بود

جبریل کہ آمد زبرِ خالقِ بیچوں　　درپیش محمد　شدو تا بود علی بود

اور

اے رہنمائے موموناں، اللہ مولا علی اے عیب پوش و غیب دان اللہ مولانا علی

فارسی سمجھنے والے باآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ مولان روم جیسا سنی عالم یہ مصرے نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ یہ اشعار تو واضح شیعہ ذہن کی عکاسی کر رہے ہیں اور نص قرآنی کے خلاف ہیں جیسا کہ پہلے شعر کے پہلے مصرع میں قرآنی آیت میں مذکور اللہ کی صفات "ہو الاول والاخر والظاہر والباطن" کو علی رضی اللہ عنہ کے لیے ثابت کیا گیا ہے۔ دیوان شمس تبریز پر جلال ہمائی نے جو مقدمہ لکھا اس میں ان اشعار کو الحاقی قرار دیا۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیار حمہ اللہ کے ملفوظات:۔

سلطان المشائخ نے اپنے مرشد شیخ فرید الدین گنج شکر کے ملفوظات کو راحہ القلوب کے نام سے مرتب کیا تھا، اس کے صفحہ ۸۵ سے ایک واقعہ نقل کرتا ہوں:

"ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم باجمیع صحابہ کبار بیٹھے ہوئے تھے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یزید پلید کو اپنے کاندھے پر بٹھائے سامنے سے گذرے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے اور کہا سبحان اللہ، ایک دوزخی ایک جنتی کے کاندھے پر سوار ہو کر جارہا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ بات سن کر کہا، یارسول اللہ یہ تو معاویہ کا بیٹا ہے۔ دوزخی کجااست؟ حضور نے فرمایا: یاعلی یہ یزید بدبخت وہ ہے جو حسن حسین اور میری تمام آل کو شہید کرے گا۔ یہ سن کر علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے تلوار نیام سے نکالی کہ 'ایشاں رابُکُشَد' مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم مانع ہوئے کہ اے علی ایسا مت کر کہ اللہ کی تقدیر یہی فیصلہ کر چکی ہے، یہ سن کر علی رونے لگے۔"

حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات بلاشک وشبہ گیارہ ہجری میں ہو گئی تھی جبکہ یزید کی ولادت حضور کی وفات کے پندرہ سال بعد ۲۶ ہجری میں ہوئی تھی، ثابت ہوا کہ یہ افسانہ سراسر جھوٹا ہے اور کسی سبائی نے یہ لغو اور من گھڑت داستان نظام الدین اولیاء کے ملفوظات میں شامل کر دی ہے۔

قرامطہ ہندوستان میں:

جب یہ لوگ ہندوستان آئے تو انہوں نے ہندو صوفیوں اور جوگیوں اور پیروں کے طور طریقے اختیار کیے اور ہندوؤں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وشنو کے دسویں اوتار کے روپ میں پیش کیا۔ عوام میں ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اپنے ناموں سے پہلے "پیر" کے لقب کا اضافہ کیا۔ پیر صدرالدین نے گجرات اور پیر شمس الدین نے ملتان میں تصوف کے پردے میں اپنے عقائد کی تبلیغ کی۔ اس بات کی تصدیق ڈاکٹر جے این ہالسٹر کی تالیف "شیعان ہند" سے بھی بخوبی ہو سکتی ہے۔ مولف اسی کتاب کے صفحہ ۳۳۳ پر لکھتے ہیں۔

"اسمعیلی سیدوں کا قافلہ قاہرہ سے چل کر سبز وار آیا۔ پیر شمس الدین سبز واری یہیں سے ملتان آیا تھا، اور اس نے صوفیوں کے لباس میں اسمعیلیت کی تبلیغ کی۔ بعض لوگوں نے شمس الدین سبز واری کو غلطی سے شمس تبریز سمجھ لیا ہے جو جلال الدین رومی کے مرشد تھے، جبکہ یہ ملتان کا پیر شمس الدین اسمعیلیہ نزاری فرقہ کا داعی تھا"

(شیعان ہند صفحہ ۳۳۳)

ایک سوال ایک تجویز

سوال: کوئی یہاں یہ سوال کر سکتا ہے کہ قرامطہ، باطنیہ، روافض کو اسکی جرات کیسے ہوتی تھی کہ وہ اپنی باتیں ان بزرگوں کی کتابوں میں ملا دیا کرتے تھے

جواب: دراصل تمام صوفی سلسلے اور انکے افراد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہایت مکرم اور لائق توقیر سمجھتے ہیں اور تین سلسلے تو حضرت علی رضی اللہ پر ختم ہوتے ہیں۔ صوفی شعرا نے جہاں خلفائے ثلاثہ کی منقبت میں زور قلم صرف کیا ہے وہاں علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں بھی اپنی عقیدت کا مظاہرہ کیا ہے، اس لیے روافض اور قرامطہ کو مبالغہ آمیز اور شرکیہ اشعار کو شامل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ باطنیہ، قرامطہ اور اسمعیلیہ حضرات نے تصوف کا لبادہ اوڑھ کر اپنے عقائد مسلمانوں میں شائع کر دیے، بعد میں آنے والے صوفیوں نے اسلاف پر تنقید کو سوادب سمجھا اس لیے قرامطہ کے عقائد کو من و عن تسلیم کر لیا اور رفتہ رفتہ ان باطنیہ کے ہم عقیدہ بن گئے۔ یہ انہی روایات کا کرشمہ ہے کہ آج چودھویں صدی ہجری میں حیدرآباد دکن، بریلی، دہلی، اجمیر، داتا دربار، پاک پتن، ملتان، اچ، سیہون اور تمام بڑے بڑے مزارات سبائیت اور باطنیت کے فروغ و شیوع کے مرکز بن گئے ہیں۔

اسلامی تصوف جو دین اسلام کی روح اور جان ہے، میں غیر اسلامی عقائد کی آمیزش سے نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ نفس تصوف ہی سے بد ظن ہو گیا دوسری طرف خود یہ غیر اسلامی تصوف اپنی ساری افادیت کھو بیٹھا بلکہ جہلا کے حق میں توافیون بن گیا اور اہل خانقا کے حق میں بے عملی کا بہانہ بن گیا۔ یہ اسی آمیزش کا نتیجہ ہے کہ وہ خانقائیں جہاں مسلمانوں کو ایزد پرستی کا درس دیا جاتا تھا ان کی روحانی اصلاح ہوتی تھی آج شخصیت پرستی بلکہ قبر پرستی کا مرکز بنی ہوئی ہیں اور جہاں ہر طرف اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جلوے نظر آتے تھے آج وہ خانقاہیں قوالی کی محفلوں میں تبدیل ہو گئی ہیں بلکہ شرک و بدعت کا مرکز بن گئیں شاید اقبال نے اسی حالت کو دیکھ کر فرمایا تھا

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر

کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی

اس غیر اسلامی نظریات کی آمیزش سے تصوف کو نقصان ضرور پہنچا ، لیکن اسلامی تصوف بالکل ختم نہیں ہوا۔ علمائے حق کے تصوف کے ایسے مراکز اب بھی موجود ہیں جہاں صوفیا بالکل اسلامی طریقہ پر لوگوں کو اصلاح فرما رہے ہیں۔

ان چند مثالوں سے یہ دکھلانا مقصود تھا کہ زمانہ قدیم سے روافض اور اہل تشیع کی یہی عیاری، مکاری اور رَوِشِ بدر ہی ہے کہ وہ اپنے فاسد و باطل عقائد اور نظریات کی ترویج کی خاطر اپنی جانب سے کوئی کتاب لکھ کر اہل سنت کے کسی نامی گرامی بزرگ، بڑے عالم دین اور محقق کی وفات کے بعد اس کی طرف نسبت کر کے شائع کر دیتے ہیں اور سیدھے سادے مسلمانوں کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ اہل سنت کا فلاں بڑا عالم اور محقق بھی وہی عقیدہ رکھتا تھا جو ہمارا ہے۔ اللہ ہمارے علما کو جزائے خیر دے انہوں نے ہر دور میں انکے حملوں کو ناکام بنا کر امت کو گمراہی سے بچایا ہے۔

ان مثالوں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس مکاری کے ساتھ باطل فرقوں نے ہماری دینی کتابوں میں اپنے گمراہ نظریات کو داخل کیا اور مشہور علمائے امت کی کتابوں میں انکی زندگی میں ملاوٹ کی بھی جرات کر گئے، آج کل تو ان کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ کسی پرانے عالم کی کتاب کو اٹھا کر اس میں جگہ جگہ اپنے نظریات کو داخل کر کے خوبصورت کور اور پرنٹ میں چھاپ کر مارکیٹ میں دے دیں۔۔!! آج کل حقیقت میں کئی ایسے گمنام کتب خانے موجود

ہیں جو کہ مختلف اسلامی موضوعات پر علما کی کتابیں چھاپ رہے ہیں، انکی کتابیں اصل پبلشر کے مقابلے میں زیادہ جاذب نظر، کوالٹی پیپر لیکن کم قیمت پر دستیاب ہوتیں ہیں۔ اب ان اسلامی کتابوں میں باطل نظریات کی آمیزش کے شر سے وہی قاری بچ سکتا ہے جس کا مستند علماء کے ساتھ تعلق ہو۔

ممتاز عالم دین مولانا علی میاں ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" مطالعہ کو وسیع کیجیے اور اس کے لیے اساتذہ سے، خاص طور پر مربی اصلاح سے اور ان اساتذہ سے جن سے آپ کا رابطہ ہے، ان سے مشورہ لیجیے۔" مولانا ندوی مزید فرماتے ہیں:

یہ ایک پل صراط ہے، اس پر سبک روی اور بہت احتیاط کے ساتھ چلنے کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ جیسے عظیم شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے توریت جیسی عظیم المرتبت آسمانی کتاب کے مطالعہ سے منع فرمادیا تھا۔

تاریخی روایتوں کا نشانہ بننے والے ایک مظلوم صحابی رسول ﷺ

حضرت امیر معاویہ رض کی شخصیت وہ ہے کہ جن پر تاریخ میں سب سے زیادہ گند اچھالا گیا ہے مختار بن عبید ثقفی جیسے مدعی نبوت جسکو حضرت عبداللہ ابن زبیر رض نے جہنم واصل کیا تھا کی یاد تو بطور ہیرو اور رہنما منائی جاتی ہے لیکن حضرت امیر معاویہ رض پر دل کھول کر کیچڑ اچھالی جاتی ہے انکے اسلام کو مشکوک قرار دیا جاتا ہے اور ہر وہ برائی انکی شخصیت میں تلاش کی جاتی ہے جو انکے کردار کو اسلام کے منافی ثابت کر سکے لیکن ان مذموم کوششوں سے نہ تو ماضی میں انکی شخصیت و کردار کو گہنایا جا سکا ہے اور نہ ہی دور جدید میں یہ کوششیں رنگ لائینگی۔انکی شخصیت پر کئی اعتراضات کیے گئے ہیں اور پھر انکے جواب میں باقاعدہ کتابیں بھی لکھیں گئی ہیں، بہت سی کتابیں نیٹ پر بھی موجود ہیں۔ہم فضائل یا اعتراضات کی کسی بحث میں پڑے بغیر انکے بارے میں کچھ مستند سطور پیش کرتے ہیں۔ان کو کھلے ذہن سے پڑھیے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اے لوگو! تم معاویہ رضی اللہ عنہ کی گورنری اور امارت کو نا پسند مت کرو، کیونکہ اگر تم نے انہیں (معاویہ رضی اللہ عنہ) گم کر دیا تو دیکھو گے کہ سر اپنے شانوں سے اس طرح کٹ کٹ کر گریں گے، جس طرح ہسطل کا پھل اپنے درخت سے ٹوٹ کر گر تا ہے۔(البدایہ والنہایہ حافظ ابن کثیر ص130)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے کہ ”میرا یہ بیٹا سردار ہے، اور شائد اللہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرائے“۔

صحیح بخاری۔جلد:۲/ انتیسواں پارہ/ حدیث نمبر:۶۶۴۳/ حدیث مرفوع

جس شخصیت کی تعریف خود حضرت علی رض نے فرمائی ہو ،جس گروہ کو خود اللہ کے رسول صل اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے گروہ میں شامل کیا ہو اور جن لوگوں سے خود حضرت امام حسن رض نے صلح کی ہو آج انکے نام لیوا کس منہ سے حضرت امیر پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔

خالص شیعہ مراجع سے حضرت امیر معاویہ رض کی شخصیت پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں .:

قیس ابن ابی خازم کہتے ہیں کہ ایک شخص معاویہ کے پاس آیا اور اُس سے کوئی مسئلہ پوچھا۔معاویہ نے جواب دیا کہ جاؤ علی علیہ السلام سے پوچھ لو، وہ سب سے بڑا عالم ہے۔اُس شخص نے کہا کہ میں نے مسئلہ آپ سے پوچھا ہے اور آپ ہی سے جواب چاہتا ہوں۔

معاویہ نے فوراً جواب دیا: افسوس ہے تم پر! کیا تم اس پر خوش نہیں کہ تمہارے سوال کا جواب تمہیں وہ دے جس کو پیغمبر خدا نے خود اپنی زبان سے علم کی غذا دی ہو اور جس کے بارے میں پیغمبر نے یہ بھی کہا ہو کہ اے علی ! تیری نسبت میرے نزدیک وہی ہے جو ہارون کی موسیٰ کے ساتھ نسبت تھی۔جس سے خلیفہ دوم حضرتِ عمر ابن خطاب متعدد بار سوال پوچھتے رہے ہوں اور جب بھی مشکل آتی تو حضرتِ عمر یہ پوچھتے کہ کیا علی علیہ السلام یہاں ہیں؟

اس کے بعد معاویہ نے غصے سے اُس شخص کو کہا کہ چلا جا۔خدا تجھے اس زمین پر پاؤں نہ پھیلانے دے۔اس کے بعد اُس کا نام بیت المال کی فہرست سے خارج کر دیا۔

حوالہ1۔ کتاب ''بوستانِ معرفت''، صفحہ305، نقل از حموئی کی کتاب فرائد السمطین، جلد1،

باب68 صفحہ371، حدیث302۔

2۔ ابن عساکر، کتاب تاریخ امیر المؤمنین ،ج1، ص370، 369، حدیث411، 410

3۔ ابن مغازلی، کتاب مناقب، صفحہ34، حدیث54۔

ماہِ رمضان میں ایک دن احنف بن قیس معاویہ کے دسترخوان پر افطاری کے وقت بیٹھا تھا۔قسم قسم کی غذا دستر خوان پر چن دی گئی۔احنف بن قیس یہ دیکھ کر سخت حیران ہوا اور بے اختیار اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔معاویہ نے رونے کا سبب پوچھا۔اُس نے کہا کہ مجھے علی کے دسترخوان کی افطاری یاد آگئی۔کس قدر سادہ تھی۔

معاویہ نے جواب دیا:''علی علیہ السلام کی بات نہ کرو کیونکہ اُن جیسا کوئی نہیں''۔

حوالہ کتاب ''علی علیہ السلام معیارِ کمال''، تالیف:ڈاکٹر مظلومی۔

وہ سوالات جن کا معاویہ کو جواب معلوم نہ ہوتا تھا ،وہ لکھ کر اپنے کسی آدمی کو دیتا تھا اور کہتا تھا کہ جاؤ ان سوالات کا جواب علی علیہ السلام سے پوچھ کر آؤ۔شہادتِ علی علیہ السلام کی خبر جب معاویہ کو ملی تو کہنے لگا کہ علی علیہ السلام کے مرنے کے ساتھ فقہ و علم کا در بھی بند ہوگیا۔اس پر اُس کے بھائی عتبہ نے کہا کہ اے معاویہ! تمہاری اس بات کو اہلِ شام نہ سنیں۔معاویہ نے جواب دیا:''مجھے(میرے حال پر)چھوڑ دو''۔

حوالہ کتاب ''بوستانِ معرفت''، صفحہ659، نقل از ابوعمر کی کتاب استیعاب، جلد3، صفحہ45

شرح حالِ علی علیہ السلام سے۔

معاویہ نے ابوہریرہ سے کہا کہ میں گمان نہیں کرتا کہ زمام دارئ حکومت کیلئے میں حضرت علی علیہ السلام سے زیادہ مستحق ہوں۔
حوالہ :کتاب ''بررسی مسائل کلی امامت''، تالیف: آیۃ اللہ ابراہیم امینی، صفحہ74، نقل از کتاب ''الامامۃ والسیاسۃ''، جلد1، صفحہ28۔

معاویہ کا خط علی علیہ السلام کے نام

''معاویہ نے اپنے خط بنام علی علیہ السلام میں لکھا کہ میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ کے فضائلِ اسلامی اور رسولِ خدا کے ساتھ قرابت داری کا منکر نہیں ہوں''۔

علی علیہ السلام کی تعریف معاویہ کی زبان سے

جب محصن ضبی معاویہ کے پاس پہنچا تو معاویہ نے اُس سے پوچھا کہ تم کہاں سے آرہے ہو؟اُس نے جواب دیا کہ میں(معاذاللہ) کنجوس ترین شخص علی ابن ابی طالب کے پاس سے آرہا ہوں۔یہ سن کر معاویہ اُس پر چلّایا اور کہا :کیا تم اُس کو بخیل ترین شخص کہہ رہے ہو جس کے پاس اگر ایک گھر سونے(طلاء) سے بھرا ہوا ہو اور دوسرا گھر چاندی سے بھرا ہوا ہو تو وہ بیکسوں کو زیادہ سونا بانٹ دے گا اور پھر طلاء اور چاندی کو مخاطب کرکے کہے گا کہ:

یاصَفْرَاءُ وَیابَیْضاءُ غُرِّی غَیْرِی أَبِی تَعَرَّضْتِ اَمْ اِلَیَّ

تَشَوَّقْتِ؟هَیهاتَ هَیهاتَ قَدْ طَلَّقْتُكِ ثَلٰثاً لاٰ رَجْعَةَ فِیكِ۔

''اے طلاءِ زرد اور سفید چاندی! میرے کسی غیر کو دھوکہ دو، کیا اس طرح تم میری مخالفت کررہی ہو یا مجھے حوصلہ دے رہی ہو۔ افسوس ہے، افسوس ہے، میں نے تجھے تین مرتبہ طلاق دے دی ہے جس کے بعد رجوع ممکن نہیں''۔

حوالہ کتاب''چرا شیعہ شدم''،صفحہ227۔

جاحظ کتاب المحاسن والاضداد میں لکھتا ہے کہ ایک دن حضرتِ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام معاویہ کی محفل میں گئے۔اس محفل میں عمروعاص، مروان بن حکم اور مغیرہ بن شعبہ اور دوسرے افراد پہلے سے موجود تھے۔جس وقت امام حسن علیہ السلام وہاں پہنچے تو معاویہ نے اُن کا استقبال کیا اور اُن کو منبر پر جگہ دی۔مروان بن حکم نے جب یہ منظر دیکھا تو حسد سے جل گیا۔اُس نے اپنی تقریر کے دوران امام حسن علیہ السلام کی توہین کی۔امام حسن علیہ السلام نے فوراً اُس خبیث انسان کو منہ توڑ جواب دیا۔ان حالات کو دیکھ کر معاویہ اپنی جگہ سے بلند ہوا اور مروان بن حکم کو مخاطب کرکے کہنے لگا:

''قَدْ نَهَیْتُكَ عَنْ هٰذا الرَّجُل۔۔۔۔فَلَیْسَ اَبُوْهُ كَاَبِیْكَ وَلَا هُوَ مِثْلُكَ۔اَنْتَ اِبْنُ الطَّرِیْد الشَّرِیْد، وَهُوَ اِبْنُ رَسُوْلِ اللّٰهِ الْكَرِیم۔

''میں نے تجھے اس مرد(کی توہین) کے بارے میں منع کیا تھا کیونکہ نہ اُس کا باپ تمہارے باپ جیسا ہے اور نہ وہ خود تمہارے جیسا ہے۔تم ایک مردود و مفرور باپ کے بیٹے ہو جبکہ وہ رسولِ خدا کا بیٹا ہے''۔

حوالہ کتاب''المحاسن والاضداد''،تالیف:جاحظ(از علمای اہلِ سنت)،صفحہ181۔

گزارش ہے کہ اہل بیت کی محبت کا دم بھرنے والے اصحاب رسول سے مخاصمت چھوڑ دیں کہ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انکی عاقبت کی سیاہی میں مزید اضافہ ضرور ہوگا اس تبرائی فکر نے اب تک تو اسلام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا بجز انتشار کے۔۔۔یہ دور سینوں کی غلاظت کو اگلنے کا نہیں بلکہ افہام و تفہیم کا تقاضہ کرتا ہے .....

یزید کی ولی عہدی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر جو سب سے بڑا اعتراض کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں یزید جیسے فاسق فاجر اور نالائق بیٹے کو ولی عہد نامزد کیا اور یزید کے دور میں جو کچھ ہوا وہ بھی اس کے ذمہ دار ہیں۔

اس اعتراض کی حقیقت کے لیے اگر ان دو سوالوں کے جوابات دیکھ لیے جائیں تو یہ فیصلہ کرنا آسان ہو گا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ فعل جائز تھا یا ناجائز وہ قصوروار تھے یا نہیں۔وہ سوال یہ ہیں۔

ولی عہدی کی شرعی حیثیت کیا ہے ؟

کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یزید کو ولی عہد بنانا شرعی طور پر جائز تھا ؟؟

اگر اس متعلق شرعی دلائل کاجائزہ لیں تو دو باتیں واضح ہوجاتی ہیں۔

1. علماء کے نزدیک یہ متفقہ علیہ ہے کہ اگر خلیفہ وقت نیک نیتی کے ساتھ اپنے بیٹے کو خلافت کا اہل سمجھتا ہے تو وہ اسے اپنا ولی عہد مقرر کرسکتا ہے۔

2. علماء کی ایک جماعت کے نزدیک ولی عہد بنانے کے لیے ارباب حل و عقد سے مشورہ کرنا ضروری ہے اسکے بغیر خلافت منعقد نہیں ہوتی۔(تفصیل ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ص 5 جلد اول)

اور ایک جماعت (علامہ ماہ روی، ابن خلدون، شاہ ولی اللہ) اسکی بھی قائل رہی ہے کہ جس میں وہ خلافت کی اہلیت سمجھتا ہو وہ تنہا اپنی مرضی سے اسے 'ولی عہد' بناسکتا ہے۔جیسا کہ اسلامی سیاست کے مشہور عالم اور مصنف قاضی ابویعلی الفراء الحنبلی تحریر فرماتے ہیں:

" خلیفہ کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے بعد کے لیے کسی شخص کو ولی عہد بنائے اور اس معاملہ میں اہل حل و عقد کی موجودگی کوئی ضروری نہیں اس لیے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ولی عہد بنایا اور حضرت عمر رضی اللہ نے چھ صحابہ کرام کو یہ فریضہ سپرد کیا اور سپرد کرتے وقت کسی نے بھی اہل حل و عقد کی موجودگی کو ضروری نہیں سمجھا۔

اسکی عقلی وجہ یہ ہے کہ کسی کو ولی عہد بنانا اس کو خلیفہ بنانا نہیں ہے۔ورنہ ایک ہی زمانے میں خلفاء کا اجتماع لازم آئے گا جو جائز نہیں ہے اور جب یہ خلافت کا عقد نہیں ہے تو اہل حل و عقد کی موجودگی بھی ضروری نہیں، ہاں ولی عہد بنانے والے کی وفات کے بعد انکی موجودگی ضروری ہے "

چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

"خلیفہ کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو ولی عہد بنائے جو اسکے ساتھ باپ یا بیٹے کا رشتہ رکھتا ہو، بشرطیکہ وہ خلافت کی شرائط کا حامل ہو، اس لئے کہ خلافت محض ولی عہد بنانے سے منعقد نہیں ہوجاتی بلکہ مسلمانوں کے قبول کرنے سے منعقد ہوتی۔اور اس وقت ہر تہمت دور ہوجاتی ہے"۔(ابویعلی الفراء، الاحکام السلطانیہ ص 9)

اب یزید کی ولی عہدی کے مسئلے پر غور فرمایئے، مندرجہ بالا احکام کی روشنی میں یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دیانت داری سے اپنے بیٹے یزید کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے تو اسے ولی عہد بنا دینا شرعی اعتبار سے بالکل جائز تھا۔اگر وہ یہ کام پوری امت کے مشورے سے کرتے تب تو باتفاق انکا یہ فیصلہ ہر فرد کے لیے واجب الاتباع ہوتا ، اور اگر تنہا اپنی رائے سے کیا تو انکے فعل کی حد تک کم از کم یہ فیصلہ باتفاق جائز تھا۔

اب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو خلافت کا اہل سمجھ کر ولی عہد بنایا تھا یا محض اپنا بیٹا ہونے کی وجہ سے؟

واقعہ یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پوری دیانت داری اور نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھتے تھے کہ یزید خلافت کا اہل ہے۔متعدد تواریخ میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک خطبہ میں یہ دعا فرمائی :

" اے اللہ ! اگر تو جانتا ہے کہ میں نے اسے (یزید کو) اس لیے ولی عہد بنالیا ہے کہ وہ میری رائے میں اسکا اہل ہے تو اس ولایت کو اسکے لیے پورا فرما دے اور اگر میں نے اس لئے اسکو ولی عہد بنایا ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے تو اس ولایت کو پورا نہ فرما"۔ (البدایہ والنہایہ ص 80 جلد 8)

غور کرنے کی بات ہے کہ جس باپ کے دل میں چور ہو یا وہ زبردستی اک کام کو مسلط کرنا چاہ رہا ہو وہ جمعہ کے دن مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر قبولیت کی گھڑی میں اپنے بیٹے کے لیے ایسی دعا کرسکتا ہے ؟

اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ انہوں نے یزید کو نااہل سمجھنے کے باوجود محض اپنا بیٹا ہونے کی وجہ سے خلافت کے لئے نامزد کیا تھا تو یہ اتنا بڑا تحکم ہے جس کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے۔کسی شخص کی نیت پر حملہ کرنا زندگی میں بھی شریعت نہیں جائز قرار نہیں دیا، چہ جائیکہ اسکی وفات کے چودہ سو برس بعد اس ظلم کا ارتکاب کیا جائے۔

یزید کے دور حکومت میں جو کچھ ہوا وہ اپنی جگہ لیکن جس وقت یزید کو ولی عہد بنایا جارہا تھا اس وقت کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ یزید کی حکومت میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کیا جائے گا، اس وقت وہ ایک صحابی اور ایک خلیفہ وقت کا صاحبزادہ تھا ، اسکے ظاہری حالات، صوم و صلواۃ کی پابندی، اسکی دینوی نجابت، اسکی انتظامی صلاحیت کی بناء پر یہ رائے قائم کرنے کی پوری گنجائش تھی کہ وہ خلافت کا اہل ہے اور صرف یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے نہیں تھی بلکہ

بہت سے دوسرے جلیل القدر صحابہ (عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ)و تابعین (حضرت علی کے صاحبزادے محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ)بھی یہ رائے رکھتے تھے کہ وہ ایک صالح آدمی ہے۔

(تفصیل البلاذری : انساب الاشراف ص 3 قسم 2) (البدایہ و النہایہ ص 233، ج 8)

صحابہ کی ایک جماعت دیانت داری کے ساتھ حضرت امیر معاویہ کے موقف کی ہمنوا تھی اور وہ پانچ صحابہ جنہوں نے اسکی مخالفت کی تھی، وہ بھی کسی ذاتی خصومت یا حرص اقتدار کی بناء پر مخالفت نہیں کررہے تھے ، بلکہ وہ دیانت داری سے یہ سمجھتے تھے کہ یزید خلافت کا اہل نہیں ہے۔ان کے علاوہ صحابہ کرام رضوان اللہ کا ایک تیسرا گروہ بھی تھا جو حضرت حسین اور ان عباس وغیرہ جیسے صحابہ کے مقابلے میں یزید کو خلافت کے لیے بہتر تو نہیں سمجھتا تھا لیکن اس خیال سے اسکی خلافت کو گوارا کررہا تھا کہ امت میں افتراق و انتشار برپا نہ ہو۔اگر ان تین گروہوں کے خیالات کو دیکھا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے یزید کے بارے میں صحابہ کرام کا یہ اختلاف درحقیقت رائے اور اجتہاد کا اختلاف تھا اور اس معاملے میں کسی کو بھی مطعون نہیں کیا جاسکتا۔

یہ بات یاد رہے کہ یہ ولی عہد بنانے کے لیے شرائط اور جائز یا ناجائز کی بحث ہے، باقی جہاں تک افضیلت کی بات ہے تو بلاشبہ حضرت حسین رضی اللہ ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر ، حضرت عبد اللہ بن زبیر وغیرہ جیسوں کی موجودگی میں یزید کو خلافت کے لیے غیر موزوں سمجھنا کچھ بعید نہیں۔اس لیے بعض صحابہ نے اس نامزدگی کی کھل کر مخالفت بھی کی۔

اور یہ بھی کہ مذکورہ بالا بحث سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ حضرت معاویہ اور مغیرہ بن شعبہ رضوان اللہ کی رائے واقعہ کے لحاظ سے سو فیصد درست تھی اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ نفس الامر میں ٹھیک کیا بلکہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ امانت کے ساتھ اور شرعی جواز کی حدود میں رہ کر کیا۔(الذھبی تاریخ الاسلام ص 267۔468 جلد 2) جہاں تک رائے کا تعلق ہے تو جمہور امت کی یہی رائے ہے کہ اس معاملے میں رائے انہی صحابہ کی صحیح تھی جو یزید کو ولی عہد بنانے کے مخالف تھے اور اس کی وجوہات کئی بیان کی گئی ہیں۔

یزید اور اسکی ولی عہدی کے سلسلہ میں ہم نے اوپر جو کچھ لکھا' جمہور امت کے معتدل اور محقق علماء کا یہی مسلک ہے ، قاضی ابو بکر بن عربی مالکی حضرت معاویہ کے اس فعل کو جائز قرار دینے کے ساتھ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں:

" بلاشبہ افضل یہ تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلافت کے معاملے کو شوری کے سپرد کردیتے اور اپنے کسی رشتہ دار اور خاص طور سے اپنے بیٹے کے لئے اسکو مخصوص نہ کرتے اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے انکو جو مشورہ دیا تھا' ولی عہد بنانے یا نہ بنانے میں اسی پر عمل کرتے' لیکن انہوں نے اس افضل کام کو چھوڑ دیا۔

(العواصم من القواصم ص222)

(مستفاد: کتاب حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق)

واقعہ کربلا اور تاریخی روایات-ایک تحقیق

سانحہ کربلا کے موضوع پر بے شمار کتب لکھی جا چکی ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں اس واقعے سے متعلق جیسا جھوٹ گھڑا گیا ہے، شاید ہی کسی اور واقعے سے متعلق گھڑا گیا ہو۔ایک فرقہ نے اپنے مذہب کی بنیاد اس سانحہ پر رکھی اور ماتم کرنا، رونا اور رلانا انکے ہاں مذہبی شعار قرار پایا ، پھر اس کے لیے ہزاروں مرثیے لکھے گئے اور اس انتہاء درجے کی مبالغہ آرائی کے ساتھ اس سانحہ کو ایک افسانے کا رنگ دے دیا گیا۔

چنانچہ محرم الحرام میں انکے واعظ اور ذاکرین عجیب و غریب من گھڑت قصوں ، کہانیوں اور اشعار میں سانحہ کربلا کی داستانیں سناتے ہیں اور ایک ایک بات کی ایسی منظر نگاری کی جاتی ہے جیسے انہوں نے واقعہ کربلا کی ویڈیو فلم کہیں سے دیکھ لی ہو۔۔یہاں کسی فرقے کی توہین مقصود نہیں بلکہ حقیقت کچھ ایسی ہی ہے، جو لوگ ماتم کی مجلس میں کبھی گئے ہیں وہ بخوبی جانتے ہونگے۔

تاریخی کتابوں کو دیکھیں تو اولین کتب تاریخ میں اس واقعے کو صرف ایک شخص نے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کا نام ہے ابو محنف لوط بن یحیی۔ان سے بالعموم جو صاحب روایت کرتے ہیں، ان کا نام ہشام کلبی ہے۔

ان دونوں راویوں کے متعلق ہم تاریخی روایات پر تحقیقی سلسلے کے دوران دو تین تحاریر پیش کرچکے۔جنگ صفین کی روایات پر تحقیق کے دوران ان کی روایات پر بھی تفصیلی تبصرہ آچکا کہ یہ سبائی راوی انتہاء کے جھوٹے ، دروغ گو اور نہایت ہی متعصب مورخ ہیں اور مخصوص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں انکا بغض مشہور ہے۔تاریخ طبری میں سوائے چند ایک کے، سانحہ کربلا کی تقریباً سبھی روایات انہی دونوں سے مروی ہیں۔

ابو محنف کا نام لوط بن یحیی تھا اس نے کئی کتب لکھیں جن میں سب سے مشہور "مقتل الحسین" ہے، امام طبری نے ابو محنف پر بہت اعتماد کیا ہے اور اس کی تاریخی کتابچوں کی روایتوں اور مقتل ابی محنف کا کل مواد فآلِ ابو محنف کی تکرار سے اپنی تاریخ میں درج کیا۔

تاریخ طبری سے کچھ روایات جمع کرکے اسکی مقتل حسین کے نام سے جو کتاب قم سے چھاپی گئی اس میں اسکی ایسی عجیب و غریب روایات ہیں جن کو عقل بھی تسلیم نہیں کرتی۔

مثلاً لکھتا ہے :

حضرت حسین رضی اللہ عنہ جس روز شہید ہوئے آسمان سے خون کی بارش ہوئی۔(مقتل الحسین رضی اللہ عنہ ص : 119)

خود ایک سِیعہ مصنف نے بھی اپنی کتاب "مجاہدِ اعظم "میں داستانِ کربلاء کی وضعی روایتوں کے ذکر میں مقتل ابو محنف کے نسخوں کا مختلف البیان ہونے کا بھی اظہار کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

اس میں صد ہا باتیں طبع زاد و تراشی گئیں۔واقعات کی تدوین عرصہ دراز کے ہوئی رفتہ رفتہ اختلافات کی کثرت اس قدر ہو گئی کہ سچ کو جھوٹ سے، جھوٹ سے سچ کو علیحدہ کرنا مشکل ہو گیا۔ابو محنف لوط بن یحیی ازدمی کربلاء میں خود موجود نہ تھے اس لئے یہ سب واقعات انہوں نے بھی سمعی لکھے ہیں لہذا مقتل ابو محنف پر بھی پورا وثوق نہیں پھر لطف یہ کہ مقتل ابو محنف کہ چار نسخے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف البیان ہیں اور ان سے صاف پایا جاتا ہے کہ خود ابو محنف واقعات کے جامع نہیں بلکہ کسی اور شخص نے ان کے بیان کردہ سماعی واقعات کو قلمبند کر دیا ہے۔

مختصر یہ کہ شہادتِ اِمام حسینؓ سے متعلق تمام واقعات ابتدا سے انتہا تک اس قدر اختلافات سے پر ہیں کہ اگر ان کو فرداً فرداً بیان کیا جائے تو کئی ضخیم دفتر فراہم ہو جائیں۔یہی مصنف ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"اکثر واقعات مثلاً اہلِ بیت پر تین شبانہ روز پانی کا بند رہنا، مخالف فوج کا لاکھوں کی تعداد میں ہونا۔شمر کا سینہ مطہر پر بیٹھ کر سر جدا کرنا، آپ کی لاش مقدسہ سے کپڑوں تک کا اتار لینا، نعش مطہر کا لکد کوب سم اسپان کیا جانا، سر اوقات اہلِ بیت کی غارت گری، نبی زادیوں کی چادر تک چھین لینا وغیرہ وغیرہ نہایت مشہور اور زبان زد خاص و عام ہیں حالانکہ ان میں سے بعض سرے سے غلط، بعض مشکوک، بعض ضعیف، بعض مبالغہ آمیز اور بعض من گھڑت ہیں"(صفحہ 178)

حادہِ کربلا کی مشہور روایتوں کو جو زبان زد خاص و عام ہیں کس وضاحت سے سرے سے غلط، مشکوک و مبالغہ آمیز و من گھڑت کہتے ہیں اور اسی کے ساتھ مقتل ابی محنف کے قلمی و مطبوعہ نسخوں کو مختلف البیان بتاتے ہیں چنانچہ مطبوعہ نسخہ کے سرسری مطالعے ہی سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بہت کچھ تصرف اس میں کیا گیا ہے بعض ایسی روایتوں کو جن کی ساختگی کتب بلدان و جغرافیہ کے ٹھوس حقائق سے عیاں ہو جاتی ہے ترک و حذف کر کے مزید واہی روایتوں کا الحاق کر دیا ہے۔

تاریخ کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ کسی شخص یا واقعے کے بارے میں متعصب راوی کی روایت کو قبول نہ کیا جائے۔اس وجہ سے اہلسنت کے بڑے علماء نے ابو محنف اور ہشام کلبی کی روایات سے اجتناب کیا۔ان دونوں کے علاوہ ایک اور مورخ محمد بن عمر الواقدی کی بعض روایتیں سانحہ کربلا سے متعلق ہیں، اس کے علاوہ ایک راوی عمار الدھنی ہیں ، یہ قابل اعتبار مانے جاتے ہیں ہیں۔واقعہ کربلا کے متعلق اہل سنت کے ہاں منقول اکثر روایات انہی کی ہیں۔ان کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔"

صدوق یسیع " عمار الدھنی بہت سچا راوی ہے اور شیعہ عقیدہ رکھتا ہے۔(تقریب التہذیب ص : 152)

صاحب تنقیح المقال بھی لکھتے ہیں۔"کان سیعا لقہ " عمار الدھنی شیعہ عقیدہ رکھتا ہے لیکن قابل اعتبار تھا۔(تنقیح المقال ص : 317 ج : 2) عمار الدھنی راوی شیعہ و سنی دونوں کے نزدیک قابل اعتبار ہے۔عمار الدھنی کی روایت تاریخ طبری ، تہذیب التہذیب ، الاصابہ میں موجود ہیں۔

تاریخ اسلامی اورجدید فکری مغالطے

کسی بھی قوم کا رابطہ اگر اپنے ماضی سے ٹوٹ جائے تو اس قوم کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی گناہ کے نتیجے میں پیدہ ہونے والے بچے کہ کوئی کچرے کے ڈھیر پر پھینک جائے اور وہ اپنے حقیقی نام و نسب کی تلاش میں ہمیشہ سر گرداں رہے .....جن لوگوں کا اپنے ماضی سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے انکے اندر نفسیاتی مسائل پیدہ ہوتے ہیں یہ نفسیاتی مسائل مختلف انداز سے شخصیات افراد اور اقوام پر اثر انداز ہوتے ہیں

ایسے لوگ جھوٹے سہاروں کو تلاش کرتے ہیں جیسے جدید استعماری دنیا کا بے تاج بادشاہ امریکہ یہ لوگ کبھی مصر کے اہراموں میں تو کبھی روم و یونان کے مقابر میں اور کبھی دفن شدہ مایا تہذیب میں اپنی اصل کھوجتے پھرتے ہیں اور صرف کھوجتے ہی نہیں بلکہ اسکو پوری دنیا پر رائج کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں یہ جدید استعماری پھندے پوری کی پوری تہذیبوں کو کسی بھوکے عفریت کی طرح نگل رہے ہیں ...

دوسرا اثر ایسی اقوام پر یہ پڑتا ہے کہ انکی کوشش ہوتی ہے کہ اپنی تاریخی برتری کو ثابت کرنے کیلئے دوسروں کی تاریخ کو بھی مسخ کر دیا جائے اسکو استشراق کہتے ہیں۔

یہ استشراقی غلاظت صرف مغربی مستشرقین تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ اسنے اپنی فکر و تہذیب اور تاریخ پر شرمندہ مسلمانوں کو بھی متاثر کیا۔عالم عرب میں طٰہٰ حسین اور بر صغیر میں سر سید اس فکر کے شدید متاثرین میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔انکے فکری مغالطوں سے دین کا جو شعبہ سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ " تاریخ اسلامی " ہے

اسلاف نے تاریخی روایات سے استفادے کیلئے جو نظام تشکیل دیا اسے " جرح و تعدیل " کے نام سے پہچانا جاتا ہے جسکی بنیاد اس نص قرآنی پر ہے۔ارشاد باری تعالی ہے:

اے اہل ایمان! اگر آپ لوگوں کے پاس کوئی فاسق خبر لے آئے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کریں۔کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کسی گروہ کو جہالت میں نقصان پہنچا بیٹھیں اور پھر اپنے فعل پر نادم ہوں۔الحجرات 49:6

اس جرح و تعدیل کے ماہر حضرات مورخین و محدثین ہیں اسکی نص بھی قرآن سے بیان ہوتی ہے۔

ترجمہ : اور جب ان کے پاس پہنچتی ہے کوئی خبر امن یا خوف کی تو اس کو مشہور کردیتے ہیں اور اگر اس کو پہنچا دیتے رسولؐ تک اور اپنے اولو الامر (علماء و حکام) تک تو جان لیتے اس (کی حقیقت) کو جو ان میں قوتِ استنباط (حقیقت نکالنے کی اہلیت) رکھتے ہیں اس کی اور اگر نہ ہوتا فضل للہ کا تم پر اور اس کی مہربانی تو البتہ تم پیچھے ہو لیتے شیطان کے سوائے چند (اشخاص) کے۔النساء/83؛

علما امت نے مستقل تاریخ اسلامی سے متعلق ایسی کتب لکھی ہیں جن میں تاریخی روایت کے نتیجے میں پیدہ ہونے والے اشکالات کا حل موجود ہے۔ابن تیمیہ رح کی منہاج السنہ ، ابن العربی رح کی العواصم من القواصم، حضرت شاہ ولی اللہ دھلوی رح کی ازالۃ الخفاء عن خلافت الخلفاء وغیرہ۔اسی طرح ماضی قریب اس موضوعات پر سینکڑوں کتابیں لکھی گئی۔

تاریخ کو اس فہم سلف سے ہٹ کر مستشرقین کے طریقے پر مجرد اخبار و آحاد کی بنیاد پر سمجھنا ایسے علمی مغالطوں میں مبتلاء کرتا ہے کہ فکر و نظر کا رخ ہی تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔جب ہماری میزان ہی ٹیڑھی ہوگی اور ہمارے ماپنے کے آلات ہی غلط ہونگے تو مطالعہ تاریخ کا مقصود ہی فوت ہو جائے گا ....

تاریخ جسکا مقصود ہمیں ہمارے اسلاف کے کارناموں سے آگاہی دلانا ہے۔

تاریخ جسکا مقصود ہمارا تعلق اپنی علمی سیاسی فکری اخلاقی اقدار سے جوڑنا ہے۔

تاریخ جسکا مقصود اپنی اصلاح اور اپنے مستقبل کی بنیادیں اپنی جڑوں پر استوار کرنا ہے اگر یہ تاریخ سلف کی فکر و نظر سے ہٹ کر دیکھی جائے تو نری جاہلیت دکھائی دیگی ...

آپ اپنے باطل پیمانوں کو لیکر پہنچ جایئے اور اسلامی تاریخ کو ماپنا شروع کیجئے نتیجہ ہمیشہ منفی ہی آئے گا کیونکہ آپکے پیمانوں میں شدید کھوٹ ہے وہ باٹ جو آپ نے ترازو کے دوسرے پلڑے میں رکھے ہیں گھسے ہوے ہیں ..

یہ باطل پیمانے ہمیں اپنی تاریخ کے معروف کرداروں کو باطل دکھاتے ہیں جو ظلم کے خلاف کھڑا ہو ان سے وہی ظالم دکھائی دیتا ہے۔

یہ وہ عینک ہے جسے پہن کر محمود غزنوی ڈاکو دکھائی دیتا ہے، شہاب الدین غوری غاصب نظر آتا ہے، عالمگیر جیسا درویش صفت حاکم منافق دکھائی دیتا، ابدالی شر پسند ہوجاتا ہے، ایوبی و زنگی ملوک بسرس مطلق العنان حاکم غرض یہ سلسلہ یہیں رکتا دکھائی نہیں دیتا بلکہ دامن صحابہ رض تک کو تار تار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اب جو بھی راستے کی دیوار بننے کی کوشش کرے وہ اسلاف پرست وکیل صفائی ناقابل قبول و غیر مقبول ہو گا ..

یہ فکری مغالطے دو دھاری تلوار ہیں ایک طرف تو یہ اسلامی تاریخ کا وہ چہرہ پیش کرتے ہیں کہ سر شرم سے جھک جائے تو دوسری طرف اپنے ہی اسلاف پر بد اعتمادی کی فضاء قائم کر دیتے ہیں اور دعوی ہوتا ہے بے لاگ تحقیق .....

پہلے تو مجددین اسلام پر سے اعتماد اٹھایا جاتا ہے اسلام کا سب سے بڑا امر حکومت اسلامی کے قیام کو قرار دیا جاتا ہے اور پھر یہ سوال ہوتا ہے یہ فقہاء، محدثین ، مورخین ، مجددین کیا کرتے رہے یہاں تک کہ شیخ السلام ابن تیمیہ رح جیسے مجدد کے تمام تجدیدی و احیائی کام پر بھی سوالیہ نشان لگ جاتا ہے کہ وہ بھی ایسی کوئی تحریک بپا کرنے میں ناکام رہے کہ اقتدار جاہلیت کے ہاتھوں سے نکل کر اسلام کے ہاتھوں میں آ جاتا .....

تو دوسری طرف .....

یہ فکر ہمیں بتاتی ہے کہ اسلامی کی عظیم الشان سیاسی قوت صرف تیس سال میں پارہ پارہ ہو گئی اسکے بعد جو اسلام نے دنیا پر حکومت کی وہ نری جاہلیت تھی یعنی اسلامی غالب ہوکر بھی مغلوب تھا حاکم ہوکر بھی محکوم تھا احسن ہوکر بھی اسفل تھا اعلیٰ ہوکر بھی ادنی تھا .....

یہ فکر کتنی تباہ کن ہے اسکا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ ایک طرف تو اسکی کدال اسلامی سیاست کی عظیم الشان عمارت کی جڑیں کھودتی دکھائی دیتی ہے تو دوسری طرف اسلاف کی شخصیات پر مکمل بد اعتمادی پیدہ کر دیتی ہے یہ ایک ایسی روشن خیالی ہے جو اپنی حقیقت میں اندھیرا نہیں اندھیر ہے .....

اس فکر کے اثرات ان نفوس قدسی پر پڑتے ہیں جنہوں نے مکتب نبوت سے براہ راست فیض حاصل کیا تھا
سید ابو الحسن علی ندوی رح ایک جگہ لکھتے ہیں !
لوگ یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ جب اسلامی دعوت اپنے سب سے بڑے داعی کے ہاتھوں اپنے دور عروج میں کوئی دیر پا اور گہرے نقوش مرتسم نہ کر سکی اور جب اس دعوت پر ایمان لانے والے اپنے نبی علیہ سلام کی آنکھ بند ہوتے ہی اسلام کے وفادار اور امین نہ رہ سکے اور رسول اللہ صل اللہ علیہ وسلم نے انھیں جس صراط مستقیم پر چھوڑا تھا ان میں سے معدودے چند آدمی ہی اسپر گامزن رہے تو ہم یہ کیسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ ان کے اندر نفوس کے تزکیہ کی صلاحیت ہے وہ انسان کو حیوانیت کی پستی سے نکال کر انسانیت کی بلند چوٹی تک پہنچا سکتی ہے اور ہم کس امید پر اس وقت دنیا کی قوموں اور غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے سکتے ہیں "
ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیے کیا اسلام کا نظام عالی شان صرف تیس سال چل سکا اس روایت کے راویوں کی چھان پھٹک سلف کی آراء پر بحث تو ایک طرف ذرا عقل ہی استعمال کیجئے اپنی فطرت سلیم کو آواز دیجئے آج دنیا میں اسلام کے غلبے کی بات کرنے والے جب اپنی بنیادوں میں یہ عقیدہ لیے بیٹھے ہونگے کہ امت کی سیاسی عمارت اسلام کے ابتدائی تین ادوار میں ہی ڈھے گئی وہ تین ادوار جنکی تعریف خود زبان نبوی سے ہوئی ہے
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ“([23]) (بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں پھر جو ان کے بعد آئیں پھر جو ان کے بعد آئیں)۔
یہی وہ لوگ تھے بے شک یہی وہ لوگ تھے جنکے ہاتھوں فریضہ اقامت دین تکمیل کو پہنچا
امام قاضی احمد القلسانیؒ المتوفی سن 863ھ" فرماتے ہیں :
سلف صالحین سے مراد وہ پہلی نسل ہے کہ جو راسخون فی العلم تھے، ہدایت نبوی کے ساتھ ہدایت یافتہ تھے۔جو سنت کے محافظ تھے۔ انہیں اللہ تعالی نے اپنے دین کو قائم کرنے کے لیے چن لیا تھا اور ان سے راضی ہوا تھا کہ وہ اس امت میں دین کے امام بنیں۔ انہوں نے امت کی نصیحت چاہنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور انہوں نے رب کی رضا کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دیا۔
اور یہاں یہ سوال کہ ان اقامت دین کے معماروں نے ہی وہ عمارت ڈھا دی جسکی بنیادوں میں انکا خوں شامل ہے
افسوس صد افسوس

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

لیکن ہمیں کتاب اللہ کی گواہی کافی ہے

وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ ۚ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ﴿﴾

اور جان رکھو کہ تم میں اللہ کے رسول موجود ہیں، اگر وہ تمہارا کہا کرتے رہے بہت امور میں، تو تم مشکل میں پڑجاؤ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمہارے لئے محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں زینت دے رکھی ہے اور کفر کو اور گناہ کو اور نافرمانی کو تمہارے نگاہوں میں ناپسندیدہ بنا دیا ہے، یہی لوگ راہ یافتہ ہیں .

ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلامی تاریخ سے اپنی مرضی کا گند چننے کے بجائے سلف کے مستقیم راستہ پر چلا جائے کیونکہ یہی راستہ ہمیں منزل مقصود کی طرف لے جا سکتا ہے .....

.....

سیکولر لابی تاریخ اور اورنگزیب عالمگیر

تاریخ محض گزرے وقتوں کا بیان نہیں بلکہ یہ ہزاروں واعظوں کا ایک واعظ اور عبرت آموزی کا ایک بہترین ذریعہ ہے ،اس کے مطالعے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی قوم نے معاشرے کی تہذیب کے لیے کیا کردار ادا کیا ، جنگ و امن ، خوشحالی اور تنگی میں اس نے عرصہ حیات کیسے گزارا۔تاریخ کے مطالعہ سے دانائی اوربصیرت ترقی کرتی ،دور اندیشی بڑھتی،حزم اوراحتیاط کی عادت پیدا ہوجاتی ہے،دل سے رنج و غم دور ہوکر مسرت وخوشی میسر ہوتی ہے، انسان میں احقاق حق اورابطال باطل کی قوت ترقی کرتی اور قوت فیصلہ بڑھ جاتی ہے، ، تاریخ کے بغیر نہ حال کی تعبیر ممکن ہے اور نہ مستقبل کی صورت گری کا کوئی حوالہ۔اس لحاظ سے تاریخ ایک امانت ہے جس کے پیغام کو بگاڑنا یا اس کے سیاق و سباق کو مجروع کرنا ایک سنگین جرم ہے۔

ایک عرصہ سے سیکولر حضرات اس کوشش میں سرگرداں ہیں کہ چیدہ چیدہ تاریخی واقعات کو انکے سیاق و سباق سے جدا کرکے مسلمانوں کی تاریخ کو نئے سرے سے لکھیں تاکہ اس سے من پسند نتائج اخذ کیے جاسکیں۔تاریخ کو اس انداز میں پیش کیا جائے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اپنے تاریخی ورثے سے نفرت پیدا ہو اور یوں انکا اپنے ماضی سے رشتہ کٹ جائے اور انہیں اپنے اسلاف کے تاریخی کارناموں سے کوئی حوصلہ اور امنگ حاصل نہ ہو۔وہ ان کی طرح پیچیدہ حالات اور بدلتی دنیا کے چیلنجز کا پورے اعتماد سے سامنا کرنے کے بجائے مایوس ، ناامید اور عزت نفس کے باب میں بالکل کھوکھلے ہوجائیں۔۔

اس کے لیے انہوں نے ایک طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ مسلم تاریخ کو برا بھلا کہا جائے ، خصوصا ان عظیم لوگوں کو جو اپنی شخصیت اور کارہائے نمایاں کی وجہ سے مسلمانوں کا فخر ہیں ، ایسے لوگ اگر اپنی تمام تر تابندگی کے ساتھ موجود رہیں تو تاریخ ایک زندہ تجربے کی شکل اختیار کرلیتی ہے' ان کو ڈاکو ، غاصب ، ظالم ، خودغرض ، عیاش ثابت کیا جائے ، انکی ذاتی زندگی کے متعلق

کہانیاں گھڑی جائیں۔اس سلسلہ میں اسلامی تاریخ کی جن نامور شخصیات کو سب سے زیادہ نشانہ بنایا گیا ان میں محمد بن قاسم ، اورنگ زیب عالمگیر، محمود غزنوی، نمایاں ہیں، انکے علاوہ ماضی قریب کی شخصیات میں علامہ اقبال ، قائدہ اعظم ہیں جنکی سیکولر صورت گری کے لیے سرتوڑ کوششیں کی جارہی ہیں۔

ہم فی الحال اورنگ زیب عالمگیر پر بات کریں گے ، ان کو سب سے زیادہ جس بات پر کوسا جاتا ہے وہ انکا اپنے بھائیوں کے خلاف ظالمانہ طرز عمل اور اپنے باپ شہاب الدین محمد شاہ جہان کو قید میں ڈالنا تھا۔

یہ بات حقیقت ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کے تین بھائی جان سے گئے اور والد شاہ جہان آگرہ قلعہ کی تنہائی میں مقید رہے لیکن ان واقعات کو پورے پس منظر سے جدا کرکے محض ایک منفرد قصہ کے طور پر پیش کرنا اور اورنگ زیب عالمگیر کو تاریخ کے ایسے کردار کے طور پر پیش کرنا کہ جس کے سر پر ظلم و ستم کا بھوت سوار تھا ، یا وہ غیر معمولی طور پر اقتدار کی ہوس میں مبتلا تھا جس کی وجہ سے اس نے یہ سب کر ڈالا، قطعا غلط اور بے ثبوت مقدمہ ہے۔

اگر سب اسکی بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اورنگ زیب کا کردار باقی ہر لحاظ سے اجلا اور بے داغ تھا تو ہم اس کے دامن پر بظاہر یہ دھبے کیوں دیکھ رہے ہیں ؟ اسے کس بات نے مجبور کیا کہ وہ باپ اور بھائیوں کے ساتھ سخت رویہ اپنائے جس کا اسے الزام دیا جاتا ہے ؟

یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جن کا جواب طلب کرنا چاہیے ، لیکن اصل حقیقت تک پہنچنے کی کدوکاوش سیکولر حضرات کا مقصد او ر مدعا ہے ہی نہیں۔انکا تو صرف ایک ہدف ہے وہ یہ کہ اس طریقہ واردات سے مطلوبہ نتیجہ کیسے حاصل کیا جائے۔سچ اگر قتل ہوتا ہے تو ہو۔ڈاکٹر محمد اقبال اپنی ایک نظم میں انہی یک چشم متنفرین کو 'کورذوقاں' کا نام دیتے ہیں جنہیں اورنگ زیب عالمگیر کے کمالات نظر نہ آئے اور انہوں نے قصے کہانیاں گھڑ لیں :

کورذوقان داستاں ہاسا ختند وسعت ادراک اونشاخسند

(اسرار خودی)

اس موضوع پر تحقیق کے لیے ہم نے بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا، تاریخی علم رکھنے والے لوگوں کو سنا۔ہمیں سب سے اچھا جواب طارق جان صاحب کی کتاب ' سیکولرازم مباحث اور مغالطے ' میں ملا۔طارق جان انسٹیٹوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد میں سینئر ریسرچ فیلو اور کئی کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں۔انکی یہ کتاب جدید فلاسفہ ، سیکولروں ملحدوں کے مغالطوں کے رد میں اپنے موضوع پر میرے نظر میں اردو زبان میں موجود سب سے بہترین کتاب ہے۔اسی کتاب سے انکے مضمون 'سیکولر لابی ، تاریخ اور اورنگ زیب عالمگیر ' کو میں یہاں پیش کررہا ہوں۔اسلوب علمی اور عام فہم ہے ، تصنیف اعلی درجے کی تحقیق کے تقاضے پورے کرتی ہے ، دلیل اور حوالے کے ساتھ مصنف نے اورنگ زیب عالمگیر کے متعلق پھیلائی گئی کنفیوزین کا بہت سیلقے اور خوبی سے تجزیہ کیا ہے۔

سیکولر لابی، تاریخ اور اورنگزیب عالمگیر

طارق جان

سیکولر لابی، تاریخ اور اورنگزیب عالمگیر

اُن کے ماخذوں کا تنقیدی جائزہ

محمد اورنگ زیب عالمگیرؒ (۱۶۱۸-۱۷۰۷) کے وجود اور کردار پر ہندو اور مغربی مؤرخین ایک عرصے سے حملہ آور ہیں۔ خود مسلم معاشرے کے اندر سے یہ وار اُن سیکولر حضرات (زنادقہ) کی طرف سے ہوا ہے، جن کے نام مسلمانوں ہی کے سے ہیں۔ ان کے دانش ورانہ فتوے کے مطابق اورنگ زیب کے کردار کا کمزور ترین پہلو اُس کا اپنے بھائیوں کے خلاف ظالمانہ طرزِ عمل اور اپنے باپ شہاب الدین محمد شاہ جہاں (۱۵۹۳-۱۶۶۶) کو بندِ اسیری میں ڈالنا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ اورنگ زیب کے تین بھائی جان سے گئے، اور والد شاہ جہان آگرہ قلعہ کی تنہائی میں مقید رہے۔ لیکن ان واقعات کو پورے پس منظر سے جُدا کر کے محض منفرد قصے سمجھنا، جیسے وہ

تاریخ کا ایسا کردار ہے کہ جس کے سر پر ظلم وستم کا بھوت سوار تھا، یا وہ غیر معمولی طور پر ہوسِ اقتدار میں مبتلا تھا، جس کی وجہ سے اُس نے یہ سب کر ڈالا، قطعاً غلط اور بے ثبوت مقدمہ ہے۔ اگر اورنگ زیب کا کردار باقی ہر لحاظ سے اُجلا اور بے داغ تھا تو ہم اس کے دامن پر بظاہر یہ دھبے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ یا اُسے کس بات نے مجبور کیا کہ باپ اور بھائیوں کے ساتھ وہ سخت رویہ اپنائے جس کا اُسے الزام دیا جاتا ہے؟ یہ وہ بنیادی سوالات ہیں، جن کا جواب طلب کرنا چاہیے۔ لیکن اصل حقیقت تک پہنچنے کی کدوکاوش سیکولر حضرات کا مقصد اور مدعا ہی نہیں۔ ان کا تو ایک ہدف ہے، اور وہ یہ کہ اس طریقہ واردات سے مطلوبہ نتیجہ کیسے حاصل کیا جائے۔ سچ اگر قتل ہوتا ہے تو ان کی بلا سے۔ ڈاکٹر محمد اقبال (م ۱۹۳۸ء) اپنی ایک عظیم نظم میں ان یک چشم متنفرین کو ''کور ذوقاں'' کا نام دیتے ہیں کہ انہیں اورنگ زیب کے کمالات نظر نہ آئے اور اُنہوں نے قصے کہانیاں گھڑ لیں:

کور ذوقاں داستاں ہا ساختند وسعتِ ادراک او نشناختند [۲]

اورنگ زیب پر یہ الزام کہ اُس نے اپنے باپ کو قید و بند میں ڈالا، جزوی صداقت کا حامل مقدمہ ہے۔ واقعات کے اعتبار سے یہ سب کچھ اب تاریخ میں مدفن ہے۔ اس پر اس طرح کا تبصرہ کہ یہ واقعات ہوئے ہی نہیں، ایک بے سُود کوشش ہوگی۔ ایسی بات کہنا علمی لحاظ سے نادرست اور غیر منصفانہ سمجھا جائے گا۔

طریقِ تحقیق و تجزیہ کا سوال

کسی بھی تاریخی حقیقت کو جاننے کے لیے پانچ ذرائع اہم ہوتے ہیں:

- تاریخ کے سٹیج پر نمودار ہونے والے اہم کرداروں کی خود نوشت۔

- اُن کے ذاتی روزنامچے اور خطوط۔
- اُس شخص کا کردار جو موضوعِ بحث ہے۔
- ماضی کے معاصر وقائع، خصوصاً اُن حضرات کی تحریریں، جنہوں نے خود اُس زمانے کے حالات کو دیکھا۔
- اور آخر میں وہ مرتب کردہ تاریخ، جو غیر جانبدار مؤرخین نے معروضی انداز میں ضبطِ تحریر کی ہو۔

ان ذرائع میں بھی مسئلہ ہوسکتا ہے۔ یہ کس حد تک قابلِ قبول ہوسکتے ہیں؟ اس بات کا انحصار کئی عوامل پر ہے، مثلاً کسی شخصیت کا خاکہ جو ایک مؤرخ تیار کرتا ہے، حالات اور کرداروں کے ضمن میں کتنا معروضی اور منصفانہ تھا؟ اُس کی قوتِ محرکہ پر کن عوامل کا اثر تھا؟ کیا اس کی پُشت پر کوئی حسد و بغض، نظریاتی، نسلی یا مذہبی تعصب تو موجود نہ تھا؟ اور کیا وہ اتنا عادل اور دیانت دار تھا کہ صحیح شہادت پیش کر سکے؟ کیا اُس میں مناسب اہلیت موجود تھی کہ وہ اپنے تنقیدی مغالطوں کے جالے صاف کر کے غلط کو سچ سے چھانٹ سکتا تھا؟

ظاہر ہے اس معیار پر چند لوگ ہی اُتر پائیں گے۔ اِس نقطہ نظر سے تاریخ نویسی ایک مشکل فن ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ حضرات جو تاریخی مواد کے اس انبار سے اپنے لئے نتائج اخذ کرتے ہیں، اُن میں بھی کم و بیش وہی خوبیاں اور خصوصیات موجود ہونی چاہئیں جو خود تاریخ نویسی کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ تشریحی وضاحت کی اہلیت جسے فرانسیسی فلاسفر میشیل فوکو (Michel Foucault) ماہرِ آثارِ قدیمہ کا نام دیتا ہے، بے حد اہم معاون ہے، ورنہ نتائج بدنما برآمد ہوسکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ انہیں ایسے پروپیگنڈے کا نام دیا جائے گا، جو ایک مخصوص سیاسی ایجنڈا کو آگے بڑھانے کے لئے درکار ہوتا ہے۔

اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تشریحی وضاحت میں ''معنی اور تفہیم کے اُفق'' کا تصور ''لازماً'' شامل ہوتا ہے۔ یہاں مقصود یہ غرض ہوتی ہے کہ بہ ظاہر متناقض اُمور اور اطلاعات میں مشترکات معلوم کی جائیں، تاکہ فہم وادراک کا اُفق اُبھر کر سامنے آئے۔ جس سے واقعات نکھر جائیں اور اُن میں باہم ربط اور توازن کی منطق دکھائی دینے لگے۔ آثار قدیمہ کا علم اپنے اُسلوب تحقیق میں اُس کشادہ مدار کو واضح کرتا ہے، جس میں کوئی بیانیہ نمو پاتا ہے۔ بقول میشیل فوکو: ''ایک وقت تھا کہ علم آثار قدیمہ ایک شعبہ کے طور پر گونگی یادگاروں سے متعلق علم تھا۔ '' وہ یادگاریں جن کا کوئی پسِ منظر نہ ہو'' اور اُس کی خواہش تھی کہ اُسے تاریخ کا مقام ملے۔ اسے معنویت اس وقت ملی، جب اُس نے ایک تاریخی بیانیہ کا رُوپ دھارا: اُس کے بالمقابل ہمارے زمانے میں تاریخ نے کوشش کی کہ اُسے علم آثار قدیمہ کا سا مقام مل جائے، تاکہ وہ تاریخی یادگار کے اندر موجود اس کی نوعیت اور ساخت کو بیان کر سکے۔'' [۳]

مزید برآں اگر ایک تاریخی شخصیت کی چھان پھٹک کرنی ہے اور اس کے ظاہر و باطن کو پوری طرح کھنگالنا ہے تو پھر اُس کی کُلی شخصیت کا جائزہ لازمی ہوگا۔ جو دراصل مظہر ہے اس کے تاریخی، اقتصادی اور سیاسی ماحول اور اُن سماجی طور طریقوں کا کہ جن میں وہ پلا بڑھا تھا۔ پھر یہ کہ اس کی مادری زبان کیا تھی اور اس نے کون سے علوم پڑھے اور یہ علوم کن سماجی رویّوں کا اظہار کر رہے تھے؟ فوکو ہی کے اندازِ بیان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں ''یادگار کی فطری اور تخلیقی تشریح'' کو معلوم کرنا ہے۔

ماخذوں کا مسئلہ: عیسائی سیّاح اور اُن کے تعصّبات

اورنگ زیب کے متعلق ان تصورات کا زیادہ بڑا حصہ فرانسیسی سیّاح اور معالج فراسوا برنیئے

(Francois Bernier ۱۶۲۵_۱۶۸۸) جیسے لوگوں کی عطا ہے، جو اسلام سے اپنے بغض و عداوت اور عیسائیت کی طرف داری کرتے ہوئے اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کی ذرا سی بھی کوشش نہیں کرتے۔ یہ یک چشمی رویہ ہر چیز کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے، سوائے اس کے جو ان کے خیال میں عیسائیت کے لیے مفید مطلب ہو۔ مثال کے طور پر برنیئے، بادشاہ نور الدین سلیم جہانگیر، اور داراشکوہ کی بڑی تعریف کرتا ہے، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ دونوں عیسائیت کی طرف مائل تھے۔

برنیئے جو دارا شکوہ کا طبیب رہا تھا، اس کی دل کھول کر تعریفیں کرتا ہے اور اپنے پڑھنے والوں کو یہ تأثر دیتا ہے کہ دارا کو بس عیسائی ہی سمجھا جائے۔ وہ دارا کے عیسائیت کی طرف جھکاؤ کے سوتے ریورنڈ بُوزی (Reverand Buzee) سے نیازمندانہ تعلقات کا نتیجہ سمجھتا ہے، جس نے اُسے عیسائیت کی تعلیم دی تھی اور بہت سے عیسائی تو پچی بھی مہیا کیے تھے، جن سے اس کا توپخانہ تیار ہوا۔ برنیئے (کے سفرناموں کا مدیر) آرچی بالڈ کانسٹیبل (Archibald Constable)، فراسوا کیٹو (Francis Catrou) کی ''ہندوستان میں مغل خاندان کی تاریخ'' کی سند کے ساتھ، جو ۱۸۲۶ کو لندن سے شائع ہوئی، یہ اضافہ کرتا ہے کہ اگر ریورنڈ ہنری بُوزی کے ''مشوروں پر عمل کیا جاتا تو قطعی ممکن تھا کہ عیسائیت تخت (دہلی) پر براجمان ہو جاتی۔'' [۴]

اسلام سے عداوت کا اظہار ہو تو برنیئے ساری احتیاط بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ اس کے نزدیک اسلام ایک ''توہم پرستی'' ہے، ایک ''مہلک اور تباہ کن مجموعۂ قوانین'' ہے جو تلوار کے زور پر نافذ ہوا، اور اب بھی اُسی ظالمانہ تشدّد کے بل پر انسانیت پر مسلّط ہے۔ اسلام کو ایک ''قابلِ نفرت فریب'' کا نام دیتے ہوئے وہ اسے ایک بے معنی اور فضول ٹوٹکا قرار دیتا ہے۔ [۵]

جہانگیر بھی عیسائیت کے لئے اپنے دکھاووں اور ظاہری بیانات کی وجہ سے برنیئر سے تائیدی سند حاصل کر لیتا ہے۔ برنیئے کہتا ہے کہ بسرِ مرگ پر جہانگیر نے ''ایک عیسائی کی موت مرنے کی تمنا کی تھی ....''[۶] آرچی بالڈ کانٹیبل، کیٹو سے مستعار ایک اور کہانی بھی سنانے کمال درجے کی جلد بازی کا سہارا لے کر کہتا ہے کہ جہانگیر بعض کھانوں پر اسلامی شرعی قدغنوں سے تنگ آ گیا تھا اور اُس نے یہ جاننا چاہا کہ: ''ہر قسم کے کھانے پینے کی بے قید آزادی کس مذہب میں ہے؟'' علماء نے اسے بتایا کہ ایسا صرف عیسائی مذہب میں ممکن ہے۔ اس پر وہ کہنے لگا: ''پھر تو ہم سب کو عیسائی بن جانا چاہیے۔''[۷]

برنیئے نے اسلام کو ''فضول ٹوٹکا'' تک کہہ دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ''جعل ساز'' قرار دیا اور یہ کہ ''یہ دین تشدد سے پھیلا''[۸] اپنی تحریر کے ان دو صفحات بعد ہی وہ پھسل گیا۔ اب وہ مسلمانوں کی تعریف کر رہا تھا کہ بہ نسبت اس بے اعتنائی کے جو عیسائی اپنے گرجوں میں روا رکھتے ہیں۔ انہیں اپنے دین سے گہری عقیدت ہے۔ بہ قول اس کے ''مسلمان مساجد میں عبادت میں مشغول ہوتے ہیں تو نہ سر کو جنبش دیتے ہیں نہ کوئی ہلکا پھلکا لفظ زبان سے نکالتے ہیں؛ بلکہ مسلمان ایک گہری اور حیرت انگیز تعظیم و تکریم کی کیفیت میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔''[۹]

وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل پر مایوسی کا اظہار بھی کرتا ہے کہ ''مسلمانوں کو کبھی عیسائی نہیں بنایا جا سکے گا۔ نہ انہیں باور کرایا جا سکتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جھوٹے نبی تھے۔''[۱۰]

برنیئے منطق میں کمزور واقع ہوا ہے، یا ممکن ہے اس باب میں اس کے تعصّبات اس کی اہلیت پر حاوی ہو گئے ہوں کہ وہ واقعات کو منطقی انداز سے پرکھ سکے، ورنہ وہ ایسی تضاد بیانی سے پہلے ضرور غور کرتا کہ جن لوگوں کی گردنیں اسلام کے سامنے زبردستی جھکائی گئی ہوں، کیا اُن کا اپنے

دین اور نبی سے رویہ ویسا ہی ہونا چاہیے، جیسے برنیئے بیان کر رہا ہے؟ یہ رویہ تو اُن ہی لوگوں کا ہوسکتا ہے جنہیں اپنے عقیدے سے پیار ہو اور جو سمجھتے ہوں کہ اسلام ہی صداقت مطلق ہے۔

مسلمانوں سے اس کا یہی تعصب ہے جو اُسے اورنگ زیب سے متنفر کرتا ہے۔ جب اورنگ زیب نے دکن کی گورنری لینے سے انکار کیا اور اپنے لئے عبادت اور استغراق کی زندگی کو ترجیح دی تو برنیئے کو یہ سب کچھ ایک مذاق آلودہ فریب لگا ''ایسی پرہیزگاری کا ڈھونگ جو اصلاً اس کے دل میں تھی ہی نہیں ...'' وہ اورنگ زیب کی ساری زندگی کو ''سازش اور اختراع کا مستقل سلسلہ'' قرار دیتا ہے۔ [11]

اورنگ زیب کے کردار کی کیفیت اگر یہی تھی تو پھر منطقی طور پر بہت سے لوگوں کو اس کے غیر حقیقی اور ظاہری تقویٰ، نفاق اور مذبذب شخصیت کا پتہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن لگتا ہے اورنگ زیب کی مبینہ چالاکی اور فریب دہی اتنے دبیز پردوں میں چھپی ہوئی تھی کہ سوائے دارا شکوہ کے اسے کوئی نہیں جانتا تھا، جو اُسے استہزائی انداز میں ''وہ نمازی'' کہتا ہے۔ یا پھر برنیئے کے مطابق دارا شکوہ اسے ''کٹ مُلّا، ہٹ دھرم جو ہر وقت نماز اور اذکار میں مشغول رہنے والا'' [12] کہہ کر مذاق اڑاتا تھا۔ گویا کہ دوسرا کوئی بھی فرد اصل عالمگیر کو نہ جان سکا اور شاہجہانی دربار میں اسے احترام اور استحسان کی نظروں سے ہی دیکھا جاتا رہا۔ ایسی سخن سازی کے سبب برنیئے نہ تو مسلمانوں کے لئے قابل اعتماد مؤرخ ہے اور نہ اورنگ زیب کی ذات اور عہد کے تجزیے کے لیے کوئی سنجیدہ حوالہ۔ دارا نے اس کی ساری توجہ اپنی طرف کھینچ رکھی ہے۔

اس مقصد کے لئے اطالوی سیاح نکولاؤ منہوچی (Niccolao Manucci ۱۶۳۹-۱۷۱۷) یا ژان تیورنیا (Jean Baptiste Tavernier ۱۶۰۵-۱۶۸۹) بھی لائق اعتبار نہیں ہیں، کیونکہ انہوں نے بھی مخصوص نقطہ نظر کے تحت دارا ہی پر نظریں جمارکھی تھیں۔ جو انہیں اپنے

خوابوں کا شہزادہ نظر آتا تھا، جو مسلم ہندستان کے تخت پر عیسائیت کو بٹھائے گا۔ مگر اورنگ زیب کی کامیابی نے ان کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا اور یُوں وہ اس کے جانی دشمن بن گئے۔ اس لئے انہوں نے دیانت کا دامن چھوڑ کر پوری ڈھٹائی کے ساتھ اورنگ زیب کی زندگی سے منسوب واقعات میں اپنے خیالات واحساسات کی رنگ آمیزی شروع کر دی۔

مثال کے طور پر برنیئے کو اورنگ زیب کا تقویٰ ایک ظاہرداری اور بہروپ لگا جس کو ''اس نے باطن میں کبھی محسوس نہیں کیا''[۱۳]، اس اندازِ فکر کو اورنگ زیب کے کردار کا موضوعی مطالعہ ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ برنیئے نے لفظ ''felt'' استعمال کیا جو قیاسی اور ثبوت طلب ہے، کیونکہ اس کا تعلق انسان کی سوچ اور ارادے کے مخفی گوشے سے ہے، جس کا باہر سے نہ مشاہدہ ہوسکتا ہے نہ تصدیق۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ بات جس کا تعلق اورنگ زیب سے بنتا ہے، پہلے ان مغربی قلم کاروں کے ذہن سے کشید ہو کر آتی ہے، جہاں اسے گھما پھرا کر مخصوص معنی پہنائے جاتے ہیں، تاکہ وہ ایک چالاک منصوبہ ساز نظر آئے، جو شارک مچھلی کی طرح اپنے شکار کا بے رحمی سے پیچھا کرتا ہے۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ برنیئے میں ایسی کوئی پراسرار اہلیت موجود تھی کہ وہ اورنگ زیب کے ذہن میں جھانک لیتا تھا، تب بھی اس کے مشاہدات کا اُن حقائق سے کوئی تال میل نہیں بنتا، جو ہمیں اورنگ زیب کے مکتوبات میں نظر آتے ہیں، اور جنہیں سیّاح موصوف اپنے مقصد کے لیے منتخب طور پر استعمال کرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس کی تاریخ نویسی ذاتی تعصب کے اظہار میں بدل جاتی ہے۔

اورنگ زیب پر سنگ باری کرنے والے اسی برنیئے نے شاہ جہاں کے اپنی بیٹی شہزادی جہاں آراء (۱۶۱۴-۱۶۸۱) کے تعلق کو جس قبیح انداز میں بیان کیا، وہ بھی غفونت زدگی اور تہمت بازی کا گھناؤنا نمونہ ہے، جس سے قاری کے جذبات واحساسات بری طرح مجروح ہوتے ہیں۔ ایک

سیّاح جس نے مؤرخ کا رُوپ دھارا ہوا تھا، اس حد تک چلا گیا کہ باپ بیٹی کے معصومانہ رشتے کو جنسی تعلق کا نام دے بیٹھا۔ واقعی ایسا معاملہ کسی یورپی حاشیہ خیال میں آسکتا ہے (اولی لکَ فاولی لکَ ثُمَّ اولی لکَ فاولی) جسے ہر قرب و تعلق میں جنس ہی نظر آتی ہے۔ خواہ یہ تعلق اتنا پاک، محترم اور مقدس ہو کہ ایک بیٹی اپنے بیمار باپ کی تیمارداری کر رہی ہو۔ برنیئے کا بیان ایک اخلاق باختہ اور ماؤف ذہن ہی کی پیداوار ہوسکتا ہے۔ کہتا ہے: ''یہ افواہ مشہور ہے کہ اس کا اپنی بیٹی سے تعلق اس حد کو جا پہنچا جو ناقابلِ یقین ہے، جس کے لیے جواز اُسے مولویوں کے فتوے سے ملا۔ جنہوں نے اسے بتایا: بادشاہ کو اس درخت کا پھل کھانے سے روکنا ظلم ہوگا، جسے اس نے خود بویا۔'' [۱۴] یہاں جھوٹ افسانہ طرازی اور سکینڈل بازی نے تاریخ نویسی کے بلند و بالا دعوے کو رُسوا کر ڈالا ہے۔ پہلے تو باپ بیٹی کا رشتہ زناکاری میں بدل دیا گیا، پھر مبینہ طور پر باپ معاملہ کو خود طشت از بام کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اس زناکاری کو مذہبی سند دینے کے لئے مولویوں کی مدد حاصل کی جاتی ہے۔ برنیئے نے اس افسانہ طرازی میں حد درجہ غیر ذمہ داری اور لچرپن کو عروج پر پہنچاتے ہوئے سوقیانہ زبان استعمال کی ہے۔

جنسی بدکاری کے تعلقات کہیں بھی ہوں یہ بنیادی انسانی اخلاقی رویّوں کی پامالی ہے، جو لوگوں کو باہمی اعتماد، ذمہ داری اور احترام کے رشتوں میں باندھے رکھتے ہیں۔ انھی اخلاقی رویوں سے ماں، بیٹا، باپ، بیٹی، بھائی، بہن اور ایسے ہی دوسرے خوبصورت رشتے جنم لیتے ہیں۔ قریبی رشتے میں جنسی بے راہ روی تو ہر وہ چیز تباہ و برباد کر دیتی ہے جو سماجی زندگی کی جان ہے۔ اس کا پہلا شکار خاندانی نظام اور اس کا تقدس ہوتا ہے، وہ خاندان جس سے زندگی کو معنی ملتے ہیں اور جو انسان کی شخصی نشوونما کا لازمہ ہے۔ لیکن برنیئے کا بیان کردہ شاہ جہان ایک حد درجہ بیہودہ اور خوفناک نفسیات کا مالک انسان نظر آتا ہے، جو بیٹی سے اپنے جنسی تعلق کو کھلے

عام نہ صرف بیان کرتا بلکہ شریعت سے اس کے لیے مدد چاہتا ہے، معلوم نہیں کون علماء اسے یہ رعایت دے دیتے ہیں کہ ''جو پودا اس نے خود لگایا، اُس کا پھل وہ چُن لے۔''

یہاں ایک لمحے کے لیے رک کر ہم اس بیان کا جائزہ لیتے ہیں۔ برنیئے اپنی لچر بیانی میں یہ بات بھول جاتا ہے کہ جو ظاہر ہو اور جس کے متعلق ملاؤں کا فتویٰ موجود ہو، اسے ''افواہ'' نہیں کہا جا سکتا، وہ امر واقعی ہوتا ہے۔ بات اگر منطق کی ہو اور استدلال پر مبنی واقعات و حالات ہوں تو برنیئے یہاں پر اپنے قاری کو بالکل مایوس کر دیتا ہے۔ برنیئے کے مدیر کانٹیبل نے فراسوا کیٹو جو حاشیہ اپنے بیان میں ضمناً جوڑا ہے، وہ اس سارے قصے کو لغو بتا کر رد کر دیتا ہے کہ ''بدنیت اور کینہ ور درباریوں کے علاوہ کہیں اور اس افسانہ طرازی کا شائبہ تک نہیں ملا۔''[15]

برنیئے چونکہ اسلام کے خلاف اپنے بُغض و عداوت سے جان چھڑا نہیں پاتا، اس لئے وہ امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ (۱۵۶۴-۱۶۲۴) کی اسلامی تحریکِ احیاء اور اس سے مثبت اثر لینے والے افراد کا تذکرہ نہیں کرتا اور انہی متاثرین میں سے ایک خود شاہ جہاں بھی تھا۔ اورنگ زیب کے مکتوبات میں شاہ جہاں کے اعلیٰ اخلاقی مرتبے اور اسلامی تعلیمات کے لئے اس کے دلی احترام کا بیان موجود ہے۔ بے چاری جہاں آراء، جسے برنیئے اپنے غیر ذمہ دار قلم کاری سے ذبح کر کے رکھ دیتا ہے، وفورِ جذبات سے اپنے باپ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتی ہے کہ وہ دین کے لئے احترام کے جذبات رکھتا تھا اور اخلاقی طور پر بلند شخصیت تھی:

> ''از اوّل تا ایں دَم، اُس نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکامات پر کتاب و سنّتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطابق عمل کیا۔''[16]

یہ اندرونی شہادت زیادہ وزنی اور قابل قبول ہے، کیونکہ یہ کسی اور نے نہیں بلکہ اس کی بیٹی نے

دی، جس سے شاہ جہاں طرف منسوب سبھی غلط باتوں کی تردید ہو جاتی ہے۔ اسلام کے لیے شاہ جہاں کی خدمات بڑی واضح ہیں، جبکہ اکبر اور جہانگیر کی پالیسیوں سے بہت کچھ نقصان ہو چکا تھا۔ جہاں تک اس کا اپنی اولاد سے تعلقات کا معاملہ ہے، یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ داراشکوہ اور جہاں آراء کے ساتھ شاہ جہاں کو بہت پیار تھا اور انہیں اپنی بھرپور توجہ سے نوازتا رہا۔

تیورنیا (Tavernier) کا معاملہ یہ ہے کہ اورنگ زیب اور شاہ جہاں تعلقات کے بیان میں اس نے بدترین تعصب کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسے یہ بات "عجیب" لگتی ہے کہ اورنگ زیب نے باپ کے اخراجات پر قدغن لگائی اور خزانہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔[۱۷] حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اورنگ زیب کو ختم کرنے کے لئے دارا کی کوششوں کو مالی معاونت شاہ جہاں ہی فراہم کر رہا تھا۔ تیورنیئر کو یہ بات جاننا چاہیے تھی کہ داراشکوہ کو ملنے والی رقوم کا سلسلہ نہ روکا جاتا تو ملک میں افراتفری، انتشار اور ہنگامہ جاری رہتا۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ تیورنیا کے سوانح نگار پروفیسر چارلس جورٹ (Charles Joret) اس کی تحریروں کو اپنی تحقیق مطبوعہ ۱۸۸۶ء (پیرس) میں چربہ سازی کا نام دیتا ہے اور واضح طور پر کہتا ہے کہ وہ اپنا تاریخی مواد برنیئے ہی سے مستعار لیتا ہے۔[۱۸] جب کہ ایچ۔ اے روز اس کے استنادی دعوؤں پر یہ سوال اٹھاتا ہے کہ وہ ایک ایسا شخص ہے کہ جس کے بارے میں یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ ان واقعات کا چشم دید گواہ نہ تھا، "جب کہ اس نے دعوے یہی کیے ہیں کہ اس نے وہ واقعات خود دیکھے ہیں۔"[۱۹] روز (Rose) یہ بھی بتاتا ہے کہ: "بیجاپور کے متعلق اس کے بیان نے ایک مضبوط شبہے کو کھڑا کر دیا ہے، کیونکہ وہ تو کبھی اس شہر میں گیا ہی نہیں تھا" "لغت اور زبان پر اس کا عبور بھی بے حد کمزور تھا: "جستہ جستہ دو ایک الفاظ" کی حد تک۔ [۲۰]

تاریخی پس منظر کا جائزہ

سچائی تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم تینوں کرداروں - شاہ جہاں، داراشکوہ اور اورنگ زیب - کا جائزہ لیتے ہوئے آٹھ پہلوؤں کو پیش نظر رکھیں، تاکہ ہر ایک کے طرزِ عمل کو اچھی طرح سمجھا جا سکے:

اوّل، کیا مغلیہ دور میں ولی عہدی کی کوئی باقاعدہ پالیسی موجود تھی؟

دوم، اپنے بڑے بیٹے داراشکوہ کے ساتھ شاہ جہاں کا طرزِ عمل کیسا تھا؟

سوم، شاہ جہاں کا اپنے تیسرے بیٹے اورنگ زیب سے رویہ کیسا تھا؟

چہارم، داراشکوہ کا اپنے چھوٹے بھائیوں سے سلوک کیسا تھا؟

پنجم، اس وقت کا عمومی سیاسی و سماجی ماحول کیسا تھا؟

ششم، کیا کوئی دھڑے بندی موجود تھی۔ جو مخالف مذہبی کیمپوں میں مجتمع ہو گئی ہو؟

ہفتم، کیا ایسے دونوں کیمپ خاموش بیٹھے تھے یا آپس میں دست و گریباں تھے؟

ہشتم، شاہجہانی دربار کے اکابرین، اہل الرائے، علمائے کرام اور عام لوگ اس سارے معاملے کو کیسے دیکھ رہے تھے؟

یہ سارے پہلو جواب طلب ہیں، کیونکہ ان کے بغیر تاریخ کے اس اہم دور اور اُس میں ملوث ان باپ بیٹوں کا کردار دُھند سے باہر نہیں نکلے گا۔ شاہ جہاں ہو یا کوئی دوسرا مغل حکمران، ولی عہدی کے ضمن میں ان کے ہاں کوئی باقاعدہ پالیسی نہیں تھی۔ اسی طرح یہ روایت بھی موجود نہیں تھی کہ باپ کی گدی پر لازماً بڑا بیٹا ہی براجمان ہوگا۔ بلکہ تخت و تاج اُسے ہی ملتا تھا، جو کشمکش میں سب سے سخت جان اُبھرے۔

شاہ جہاں بالکل اچانک بیمار پڑا۔ ہوسکتا ہے اُسے پہلے سے کچھ بیماری لاحق ہو، لیکن جب زوال کا وقت آیا تو سب کچھ اچانک ہوا اور وہ حکمرانی کی باگ تھامے رکھنے کے قابل نہ رہا۔ اپنی بیماری سے برسوں پہلے اپنی اولاد کی حکمرانی کی صلاحیتوں پر ایک درباری سے بات کرتے ہوئے اس نے داراشکوہ پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا، جبکہ اورنگ زیب کے متعلق اُس نے مثبت رائے دی۔ بیشک اس کا دل دارا کے ساتھ تھا، اور عقل کا فیصلہ اورنگ زیب کے حق میں تھا۔ لیکن بالآخر دلی جذبات نے عقل وخرد کو چت کر دیا۔

کوئی چاہے تو دارا کے لئے شاہ جہاں کی محبت کا معقول جواز پیش کرسکتا ہے۔ یہ ممکن بھی ہے کہ چونکہ دونوں ہمیشہ یکجا رہے، اس لئے اس پدری شفقت میں اضافہ ہوتا گیا۔ بیشتر وقت شاہ جہاں نے دارا کو دربار سے قریب رکھا، جبکہ اس نے دوسرے بیٹوں کو صوبوں کی گورنری اور انتظامی اُمور میں مشغول رکھا۔ باپ بیٹے کے قرب وتعلق کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ داراشکوہ ذاتی طور پر ایک پُرکشش انسان تھا اس کا رکھ رکھاؤ، علم وادب سے اس کا لگاؤ، اس کی دلچسپ صوفیانہ حکایت گوئی جو اس میں صوفیاء اور ہندو جوگیوں کی صحبت سے پیدا ہوئی تھی۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ دارا اپنے باقی بھائیوں سے زیادہ وجیہہ، خوبصورت اور خوش اطوار تھا۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ، لیکن وہ اُمورِ سلطنت کے لئے نہیں بنا تھا۔ ذہنی صلاحیتیں ہوں یا جسمانی خوبیاں، اس کا اورنگ زیب سے کوئی تقابل نہ تھا۔ زندگی کے متعلق اس کے رویے میں بھی خرابی تھی۔ وہ آزاد خیال بھی تھا اور مذہبی معاملات میں، عقائد میں تطبیق دینے والا صلح کل، یعنی اکبری پالیسی کا پیروکار بھی تھا۔ اسے ہندو دانشوروں اور مذہبی پنڈتوں نے گھیرا ہوا تھا۔ ایک ایسے مسلم معاشرے میں جو ہندوانڈیا میں اپنی شناخت اور بقا کے حوالے سے روز افزوں پریشانی کا شکار تھا، وہ قابل قبول کردار نہ تھا۔ ان احساسات کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تجدیدی تحریک مزید تیز تر کر رہی

تھی۔ مسلمان عوام سمجھ رہے تھے کہ اگر دارا اقتدار میں آیا تو یہ ان کی بربادی کا پیغام ہوگا۔

سب سے بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے دارا شکوہ کے ذہن میں بچپن ہی سے یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ وہ مستقبل کا حکمران ہے۔ پیار، محبت اور نیاز مندی کا جو پُر سرور ہالہ اس کے گرد موجود رہا، اس میں اس کی اُٹھان ایک انا پرست، خوشامد پسند اور بڑبولے انسان کے طور پر ہوئی۔ ماحول کی ساری آسانی اور سازگاری کے باوجود وہ خود اعتمادی سے عاری اور داخلی سطح پر ایک مضطرب و مذبذب انسان تھا۔ یہ چیزیں اس کے احوال و آثار سے بآسانی دیکھی جاسکتی ہیں۔ حسد اور خوف کے جذبات اس کے دماغ میں جنم لیتے اور ظاہری زندگی میں اُبھرتے رہے۔ وہ یہ حقیقت نہ سمجھ سکا کہ اصل مسئلہ خارج میں نہیں بلکہ خود اس کے اندر اُس کی ذات میں پیوست ہے۔ اپنے چھوٹے بھائی اورنگ زیب کی شکل میں وہ اپنی شکست دیکھ رہا تھا۔ اورنگ زیب کی فوجی فتوحات، انتظامی کامرانیاں اور اس کے مقابلے میں اپنی ڈھل مِل کیفیت اور سرکاری اُمور میں بُری کارکردگی کے زیر اثر وہ اعصابی تناؤ کا شکار ہوتا چلا گیا۔ اس کی اس ذہنی حالت کا اظہار اُن سازشوں سے ہو رہا تھا جو وہ بھائی کے خلاف کر رہا تھا۔

اپنے آپ کو غیر محفوظ جان کر اُسے اسی راستے میں عافیت دکھائی دی کہ باپ کی محبت، قوت اور وسائل کے ساتھ مضبوطی سے جُڑا رہے، اور اسے دوسرے بیٹوں سے بدظن کر کے دور رکھے۔ اس مقصد کے لیے اورنگ زیب کی بھیانک تصویر کشی ضروری تھی۔ اس کے بارے میں یہ تاثر گہرا کیا کہ وہ آگے بڑھنے کے مرض کا شکار تھا اور یہی عزائم اُسے مجبور کر رہے تھے کہ بغاوت کی آبیاری کرے، اور جسے اپنے ماں باپ کی کوئی فکر نہیں۔ ان باتوں نے شاہجہاں کو اورنگ زیب کی طرف سے مستقلاً تشویش میں مبتلا کر دیا۔

شیخ احمد سرہندیؒ کی احیائی تحریک نے سترہویں صدی عیسوی کے ماحول میں بڑی ہلچل پیدا کردی تھی۔ جب اورنگ زیب اور اس کے بھائی نوجوانی کی سرحد میں داخل ہوئے تو یہ تحریک پورے زوروں پر افقی اور عمودی ہر دو سطح پر آگے بڑھ رہی تھی۔ اس تحریک سے پہلے شاہجہاں روشناس ہوا اور پھر خود اورنگ زیب متاثر ہوا۔ عوام الناس تو پہلے ہی اس کے زوردار بہاؤ کے ساتھ تھے۔

اس کے برعکس مذہب اور ثقافتوں کے حوالے سے داراشکوہ کا طرزِ عمل ہندو اشرافیہ اور انتظامی اہلکاروں کے لیے جذباتی اپیل رکھتا تھا۔ وہ دارا کی شکل میں اکبر بادشاہ کا دوسرا جنم دیکھ رہے تھے کہ جس کی تخت نشینی سے بالآخر اسلام مقامی اثر پذیر ثقافت میں اپنا وجود کھو بیٹھے گا۔ اسی لیے انہوں نے اپنا سب کچھ دارا پر لگا دیا تھا۔

چنانچہ ہم اس صورتِ حال میں جو کچھ دیکھ رہے ہیں، وہ مسخ شدہ نفسیات، طاقت کے کھیل، اندھی محبت اور ایک ابلتا ہوا تہذیبی آمیزہ ہے۔ جب پس منظر میں یہی تصویر دکھائی دیتی ہے تو مذکورہ شخصیات، اورنگ زیب اور دوسرے لوگوں کے عزائم کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔۔

سب سے پہلے ہم برنیئے کے اس الزام کو لیتے ہیں: ''کہ جب اورنگ زیب نے اوائل میں دکن کی گورنری چھوڑنے کی آرزو کی تو اس کے پیچھے اخلاص نہیں تھا'' بلکہ یہ باپ اور بھائیوں کو اقتدار اور حکمرانی کے منظر سے ہٹا کر سلطنت ہتھیانے کی تدبیر تھی۔ وہ اُس کی شخصیت کو محض دجل و فریب سمجھتا ہے اور اُس کی مذہبیت کو دکھاوا قرار دیتا ہے، سردست ہم ان الزامات کو جوں کا توں قبول کرتے ہوئے شواہد ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ معاملہ تحقیق کا بہت اہم سوال لیے ہوئے ہے۔ کیونکہ اگر اورنگ زیب کوئی مکار بہروپیا تھا، تب برنیئے کے الزامات

واقعی سچ ثابت ہوں گے۔ لیکن اس کے برعکس اگر وہ ایک مخلص اور راست باز انسان تھا اور اس کے قول و فعل میں تضاد نہیں تھا تو اس کے خلاف سارے الزامات پادر ہوا ہوں گے۔

اورنگ زیب کے مکتوبات کے مطابق اس نے دو بار گورنری سے دست برداری کی پیش کش کی، لیکن باپ کی ناراضی دیکھ کر فیصلہ واپس لے لیا۔ اس کا پہلا استعفا اس وقت سامنے آتا ہے جب اسے دکن کا گورنر نامزد کیا جاتا ہے۔ دس برس بعد وہ پھر اُس موقع پر یہ پیش کش دہراتا ہے، جب اس کی بہن شہزادی جہاں آراء اپنی سالگرہ پر آگ میں جھلس جاتی ہے۔ اورنگ زیب اُسے دیکھنے آتا ہے۔ شاید بہن کی حالت دیکھ کر وہ اتنا دل گرفتہ ہوتا ہے کہ وہ شاہی لذائذ و اقتدار پر لات مار کر تنہائی اور خلوت گزینی کی زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔[۲۲]

اس کے ایک مکتوب میں دست برداری کی وجہ درج ہے۔ اپنی بہن کو لکھے گئے خط میں وہ اُن ناانصافیوں کا تذکرہ کرتا ہے جو اس کے ساتھ کی گئیں۔ اگرچہ وہ کسی کا نام نہیں لیتا، لیکن واضح طور پر اس کا اشارہ باپ اور بڑے بھائی دارا شکوہ کی طرف ہے۔ زیادہ دُکھ اُسے دارا شکوہ کے ہتک آمیز رویے سے تھا، جس نے شاہجہاں کو آمادہ کر کے، شورش زدہ دکن کے گورنر کی حیثیت سے اس کے انتظامی فنڈ کاٹ دیے اور ایک ایسے وقت اس کی زیرِ کمان فوج میں کمی کرا دی، جبکہ وہ مملکت کے دشمنوں سے برسرِ پیکار تھا۔ اس تجربے نے اسے داخلی سطح پر توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ زندگی میں پہلی بار وہ دنیا کا حقیقی چہرہ دیکھ رہا تھا: بدشکل، مکروہ اور ظالم دنیا، جس میں قابلیت اور عبقریت، اخلاق اور مملکت کے لئے خدمات کی کوئی قدر و قیمت اور وقعت نہ تھی۔ وہ لکھتا ہے:

اس فانی دنیا اور اس کے فوائد و منافع کے لیے جان لڑانا بے سود ہے۔ وہ بے توقیری کی اس زندگی سے چھٹکارا چاہتا ہے جو دوسروں نے اس پر تھوپ دی تھی، تاکہ دوسروں کو سکون میسر

آجائے کہ اچھا ہوا اقتدار کی راہداریوں سے ایک ممکنہ چیلنج تو رخصت ہوا۔[۲۳]

ان خطوط سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اورنگ زیب کو اقتدار کی کوئی شدید خواہش تھی، بلکہ وہ تو سب کچھ دوسروں کے لئے چھوڑ کر گوشہ نشین ہونا چاہتا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہی اورنگ زیب جوان لوگوں کی نظر میں ایک ہٹ دھرم شخص تھا، جس نے ان کے بقول چالاکی سے زہد و تقویٰ کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا، وہ تخت نشینی کے بعد ۴۳ سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیتا ہے۔[۲۴] اس کا ہم عصر شاعر ضمیر ان مبارک لمحات کو اپنے ایک قطعہ میں جاوداں کر دیتا ہے۔

تو حامیِ شرع و شارع حامیِ تو
تو حافظِ قرآں و خدا حافظِ تو
تو دین و شریعت کا حامی و مددگار ہے
اور شارع تیرا حامی اور ناصر ہے، تو حافظِ قرآن ہے اور
خدا تیرا حافظ ہے۔

اُس کا ۴۳ سال کی عمر میں قرآن پاک کو حفظ کرنا خصوصاً اہم بات ہے۔ کیونکہ چھوٹی عمر کے برعکس اتنی بڑی عمر میں حفظِ قرآن بہت مشکل کام ہے۔ بچے تو والدین کے دباؤ اور استاد کی سختی کے تحت ایسا کرتے ہیں، لیکن بڑی عمر کا انسان آزاد مرضی سے حفظ کی مشقت اسی وقت اُٹھائے گا جب دینی جذبہ اسے ایسا کرنے پر اُبھارے گا۔

کافی شہادت موجود ہے کہ اورنگ زیب باجماعت نماز کا پابند تھا اور بڑے شوق سے روزے رکھتا تھا۔ غریب کی مدد کا معاملہ ہوتا تو اس کے ہاتھ بڑے فراخ تھے۔ تاج پوشی کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ عام آدمی کو متاثر کرنے والے اسّی (۸۰) ٹیکس ختم کر دیے۔ ''مآثر عالمگیری''

میں ہے کہ حالتِ جنگ میں بھی وہ خشوع کے ساتھ نماز ادا کیا کرتا تھا۔ بلخ کی مہم کے دوران دشمن کے دستوں نے اسے گھیر لیا تھا لیکن (نماز کے وقت) وہ گھوڑے سے اترا اور امامت شروع کر دی۔ امیر بلخ عبدالعزیز خان یہ منظر دیکھ کر اتنا سخت متاثر ہوا کہ اُس نے لڑائی سے یہ کہہ کر ہاتھ کھینچ لیا کہ: ''ایسے شخص سے لڑنا اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔'' [۲۵]

اورنگ زیب عالمگیر کا رویہ اپنے ذاتی سٹاف، امرائے دربار اور عام لوگوں کے ساتھ یکساں لحاظ، مروت اور مساوات کا تھا۔ باپ نے جب نصیحت کی کہ ''سب کو ایک سا نہ سمجھے اور مقام و مرتبے کے لحاظ سے تمیز روا رکھے۔'' تو اُس نے جو جواب دیا وہ اس کے اعلیٰ اخلاق کا مظہر تھا۔ کہتا ہے: ''عزت اور سربلندی انسانوں سے نہیں ملتی، بلکہ کائنات کے خالق اور مالک اللہ کے حضور سے نصیب ہوتی ہے۔'' اپنے برتاؤ میں وہ اس حدیث نبویؐ کا اتباع کرتا ہے جس کے راوی حضرت انس بن مالکؓ ہیں: مَنْ اَذَلَّ نَفْسَهٗ. عَزَّزَهُ اللہ (جو عاجزی اختیار کرتا ہے، اللہ اُسے عزت سے نوازتا ہے) [۲۶] اورنگ زیب سمجھتا تھا کہ کسی کی عزت نفس کو مجروح کرنا سب سے بڑا گناہ ہے۔

تخت نشینی کے بعد اس نے نفاذِ شریعت کے لئے بنیادی اقدامات کیے۔ اخلاقی ماحول کو گندگیوں سے پاک کیا۔ جید علماء کی مجلس قائم کر کے قوانین کی تدوین کی، جس کے نتیجے میں ''فتاویٰ عالمگیری'' منصۂ شہود پر آ گئی۔ یقیناً اس کے یہ سارے اقدامات مذہبی بہروپ کے زمرے میں قطعاً نہیں آتے۔

اورنگ زیب نے شاہی خانوادے میں آنکھ کھولی۔ وہ شاہ ابن شاہ تھا، جس کے پاس ایک ایسی مملکت کے کُلی اختیارات اور بے پناہ وسائل تھے، جو اپنے وسیع خزانوں کے لئے مشہور تھی۔ وہ

چاہتا تو ہمارے آج کے ''منتخب'' حکمرانوں کا چال چلن اپنا سکتا تھا کہ نفسانی عیش وعشرت میں لُوٹ لگاتا رہتا۔ لیکن وہ اپنے رب اللہ بزرگ وبرتر کی کبریائی وجبروت کے حضور جُھک گیا۔ نرم وگداز بستر سے علیحدہ رہ کر اس کی راتیں تہجد میں گزرتیں۔ زیادہ اہم بات یہ کہ وہ تہذیبوں کے اسبابِ زوال پر بڑی گہری نظر رکھتا تھا۔ وہ اکثر اس فکر اور تشویش میں مبتلا رہا کہ برصغیر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ اُسے سامنے تاریک دن نظر آرہے تھے۔ اس کے اجداد اور پیش رووں نے اسلام کی تبلیغ اور استحکام میں برس ہا برس جس تساہل اور لاپروائی سے کام لیا تھا، اس کے اثرات سامنے آرہے تھے۔ وہ اس تباہی وبربادی کا رُخ موڑنا چاہتا تھا۔ اورنگ زیب کی تاریخی یادداشت بہت تیز تھی۔

اورنگ زیب نے ایسے ملک میں آنکھ کھولی جس نے جلال الدین اکبر کی اسلام سے دشمنی بھی دیکھی، جس کی یہ خواہش اور کوشش تھی کہ مسلم سوسائٹی کو دینِ اسلام سے پھیر دے اور اس کے نتیجے میں (ہندوؤں کی خوش دلی اور تعاون کی شکل میں) اپنے لئے سیاسی فوائد سمیٹ لے۔ اورنگ زیب کو اپنے پردادا اکبر، اپنے دادا جہانگیر اور شیخ احمد سرہندی کے باہمی نزاع کا بھی پورا علم تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اکبر نے تو بچوں کے ناموں کے ساتھ ''محمد'' کا لاحقہ لگانے کی بھی ممانعت کردی تھی، اسلامی کیلنڈر منسوخ کردیا تھا اور عربی زبان، قرآن پاک اور شرعی قوانین کی تعلیم پر پابندی عائد کردی تھی۔ اُس سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ تھی کہ اکبر نے مسلمانوں کو نماز پڑھنے، روزہ رکھنے اور حج بیت اللہ تک پر جانے سے روکنے کا حکم دیا، جبکہ شراب نوشی اور سُور کے استعمال کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

بقول یورپی مؤرخ وِنسنٹ سمتھ (Vincent A. Smith) جس نے اکبر پر تحقیقی کام کیا

ہے، اسے اکبر مسلمان نہیں نظر آتا تھا۔ برنیئے کا مدیر آرچی بالڈ کانسٹیبل، کارٹو کی سند کے ساتھ کہتا ہے: ارتداد شاہی خاندان میں در آیا تھا۔ شاہ جہاں کی دو بیٹیوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔[۲۸] اس درجہ سنگین صورتِ حال میں مسلمان جانتے تھے کہ وہ عددی اعتبار سے اقلیت ہیں اور بحیثیت مسلم اُمت اُن کا وجود اپنے عقیدے سے مضبوطی سے جڑے رہنے پر منحصر تھا۔ کفر کے اس ماحول میں بقا کے لیے وہ لازمی طور جانتے تھے کہ ان کے تہذیبی رویئے ہر طرح کے غیر اسلامی اثرات سے پاک رہنے ضروری ہیں۔

اس پسِ منظر میں اورنگ زیب، داراشکوہ چپقلش محض تختِ دہلی کا جھگڑا نہ تھا۔ یہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین تہذیبوں کا ٹکراؤ کا فطری مظہر تھا جن کی نمائندگی دو مثالی نمونے (عالمگیر اور دارا) کر رہے تھے۔ داراشکوہ سمجھتا تھا کہ اُپنشد (Upanishad) قرآن پاک سے برتر کتاب ہے۔ اس نے ''سیر الاسرار'' کے نام سے خود اس کا فارسی ترجمہ کیا۔ الہ آباد کے شیخ محبّ اللہ کے نام اس کا خط تاریخ نے محفوظ رکھا ہے، جس میں وہ اس حد تک جاتا ہے کہ وہ اپنے ''وجدانی معارف واثرات کو (الہامی) کتب کے مندرجات سے بدرجہا بہتر سمجھتا ہے۔[۲۹]

داراشکوہ کے ایسے خیالات مسلمانوں میں بے چینی اور اشتعال پیدا کر رہے تھے۔ شاہی تخت پر اس کے ممکنہ قبضے کا خیال ہندوؤں کو اس کی طرف کھینچ رہا تھا، کیونکہ دارا کی کامیابی میں انہیں مسلمانوں کے تسلط کے خاتمے کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ مسلمانوں کے لئے ہندوؤں کا داراشکوہ کی نامزدگی پر مجتمع ہونا گزرے ہوئے عہدِ اکبری کی تاریخ دہرائے جانے کے مترادف تھا۔ ایک بار پہلے بھی ہندوؤں نے یہ کوشش کی تھی کہ ایک ہندو رانی کے بطن سے پیدا ہونے والا جہانگیر کا بیٹا خسرو، اکبر کا جانشین بن جائے۔

۱۶۵۷ عیسوی کی ابتداء میں شاہ جہاں بیمار پڑا تو سلگتے جذبات، جو ابھی تک قابو میں تھے، دو مخالف اور متحارب قوتوں میں ڈھلنے لگے۔ دارا شکوہ نے اس میں امکانات کو سب سے پہلے بھانپا اور شاہ جہاں کو اس کے دوسرے بیٹوں سے کاٹ کر جدا کر دیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے دربار کو ایسے امراء سے پاک کرنا شروع کر دیا، جن کے متعلق اندیشے تھے کہ وہ دوسرے شہزادوں خصوصاً اورنگ زیب سے مراسم رکھتے ہیں۔ دربار میں اورنگ زیب کے رابطہ افسر عیسیٰ بیگ کو پہلے حوالۂ زنداں کر دیا گیا، پھر اس کی جائیداد ضبط کر لی گئی۔ دارا شکوہ نے مُراد بخش (م: ۱۶۶۱ء) کے خلاف بھی اقدام کیا اور گجرات میں اس کی جگہ اپنے حامی قاسم خان کو مقرر کر دیا۔ فتنہ انگیزی بڑھانے کے لئے اس نے مُراد کو آمادہ کیا کہ برار میں اورنگ زیب کا علاقہ اپنے قبضے میں لے لے، تاکہ دونوں میں جنگ بھڑک اُٹھے۔ لیکن مُراد کو سازش کی سُن گن مل گئی۔ اس نے سُورت فتح کر کے خود اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

اورنگ زیب اس ساری صورتِ حال کا دکھ اور افسوس کے ساتھ مشاہدہ کر رہا تھا۔ ہر گزرے دن کے ساتھ وہ دارا شکوہ کے ہاتھ اپنی گردن پر تنگ ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اگر دارا شکوہ کی صوفی طبیعت میں کوئی خفیہ پہلو تھا تو وہ جلد ہی ظہور میں آنے والا تھا۔ اس کے ضمن میں تین باتیں بالکل واضح تھیں: وہ اسلام کا مخالف اور آزاد رَو تھا اور تخت پر قبضہ کے لئے پوری بے رحمی سے سب کچھ کر گزرنے پر تُلا ہوا تھا، خواہ اس کی جو بھی قیمت اُسے چکانی پڑے۔ اس نے قبیح حربے جاری رکھے۔ وہ شاہ جہاں کے جعلی دستخطوں کے ساتھ شاہی فرامین جاری کرتا، شاہجہاں کے صحت مند ہونے کا تاثر پھیلاتا اور بھائیوں کے خلاف ایک عظیم جنگی مشین کی تیاری اور تقویت میں جتا رہا۔ پہلے قدم کے طور پر اس نے دکن سے مغل افسران کو واپس بلا لیا، جو دراصل اورنگ زیب کا سیاسی حلقۂ اثر تھا۔ پھر اس نے مالوہ کو ضبط کر لیا جو اورنگ زیب کی جاگیر تھی۔ یہ گویا

اورنگ زیب کی پشت میں خنجر گھونپا تھا، جو اس وقت بیجا پور میں جنگجو ہندو مرہٹوں سے برسرِ پیکار تھا، جو سلطنت دہلی کے دشمن تھے۔ کوئی شک نہیں کہ اورنگ زیب کے لئے بے حد مشکل صورتِ حال پیدا کر دی گئی، جو بیجا پور اور گولکنڈہ کو یہ تأثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ مملکت مختلف دھڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ مرکزی اقتصادی امداد اور فوجوں میں کٹوتی نے دکن میں اس کی موجودگی قریب قریب غیر یقینی بنا دی تھی۔ بڑا بھائی کھل کر اس کے خلاف میدان میں آ گیا تھا۔ اورنگ زیب کی تحقیر کرنے والے بتائیں کہ ان حالات میں اُسے کیا کرنا چاہیے تھا؟ کیا وہ اپنا آپ ایک منتقم مزاج بھائی کے سامنے ڈال دیتا یا اپنی زندگی بچاتا؟

اس خونیں اور مایوس کن منظر میں شہزادہ شجاع (م: ۱۶۶۰ء) نے بھی اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ بالفاظِ دیگر اورنگ زیب جس نے اپنی شاہی خواہشات کو تھامے رکھا تھا، مگر اس کے سامنے تخت کے تین دعوے دار سامنے آ گئے تھے۔ تنِ تنہا اس نے جلد سے جلد شاہ جہاں تک پہنچنا چاہا۔

جنوری ۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب برہان پور پہنچا۔ وہیں سے اس نے باپ کو خط لکھ کر اس کی صحت کا پوچھا۔ مہینہ بھر انتظار کے باوجود اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ اُسے اب بھی معلوم نہ تھا کہ آگرہ میں کیا کھچڑی پک رہی تھی۔ ایسے میں اچانک عیسیٰ بیگ، قید خانے سے آزادی ملتے ہی اورنگ زیب کے لشکر گاہ میں وارد ہوا، اور شاہی دربار میں جاری دارا شکوہ کی ریشہ دوانیوں کے قصے عالمگیر کے گوش گزار کر دیے۔ یوں خبردار ہو کر اورنگ زیب، مُراد سے ملنے دیپال پور چل پڑا۔ وہاں سے دونوں بھائی آگرہ کی طرف روانہ ہوئے تا کہ بیمار باپ کو دیکھ سکیں اور اس سے دارا شکوہ کے ضمن میں انصاف کے طلب گار ہوں، جو اُن کے خلاف ''مارو یا مرجاؤ'' کے

منصوبے باندھے بیٹھا تھا۔ جنگی چالوں کا ماہر ہونے کی بناء پر اورنگ زیب ایک ہی حملے میں شہر پر قبضہ کرسکتا تھا، لیکن وہ اب بھی صبر وضبط سے کام لے رہا تھا۔ اس نے اپنا قاصد راجا جسونت سنگھ کے پاس بھیجا اور اس پر زور دیا کہ وہ بادشاہ تک اورنگ زیب کے جانے کی راہ میں مزاحم نہ ہو، کیونکہ اس کے پیش نظر صرف ملاقات تھی۔ لیکن جسونت سنگھ نے سخت ہتک آمیز انداز میں اُسے راستہ دینے سے انکار کردیا۔ اس نے اورنگ زیب کی شخصیت کا ذرا بھی لحاظ نہ کیا۔ بلکہ مزید یہ بھی کہہ دیا کہ یہی بادشاہ سلامت کی مرضی تھی۔ ۳۰

یہ دیکھ کر کہ جھگڑا بڑھ رہا ہے، دربار کے مسلمان امراء نے بھی داراشکوہ کو مشورہ دیا کہ اورنگ زیب کو باپ سے ملنے دے۔ لیکن اس وقت تک ہندو حلقہ داراشکوہ کے گرد مکمل ہو چکا تھا، اور دارا کو اب باپ، بھائیوں کے برعکس وہی اچھے لگ رہے تھے۔ راؤ ستر سال اور رام سنگھ نے رائے دی کہ مقابلہ کیا جائے اور داراشکوہ فوراً تیار ہوگیا، کیونکہ اُسے اورنگ زیب کے خلاف من کی مراد، اسی میں پوری ہوتی نظر آرہی تھی۔ اس طرح ہندو مدد اور تائید سے حوصلہ پا کر اس نے مسلمانوں کے خلاف یہ ذلّت آمیز الفاظ کہے: ''بہت جلد میں ان کوتاہ لباسوں کو ستر سنگھ کے ذاتی ملازموں کی طرح بھاگنے پر مجبور کردوں گا۔'' ۳۱

اُدھر وہی ہوا جو ہونا تھا کہ راجہ جسونت سنگھ، اورنگ زیب کے دستوں سے پہلی جھڑپ ہوتے ہی بھاگ دوڑا۔ اورنگ زیب چاہتا تو اسے روند کر رکھ دیتا، لیکن اس نے خود اُسے فرار ہوجانے دیا۔ شاہ جہاں کے نام اپنے ضمنی مکتوب میں وہ اپنی سوچ کا اظہار یوں کرتا ہے:

> ''اگر میرا آپ سے ملنے کے علاوہ کچھ اور مقصد ہوتا تو میں بڑی آسانی سے جسونت سنگھ اور اس کے لشکریوں کا تعاقب کرکے ان سب کو موت کے

گھاٹ اُتار دیتا۔ خصوصاً جبکہ وہ بے بس اور ذلیل ہوکر شکست کی وادی میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔... لیکن مقصد تو آپ تک پہنچنے کے لئے راستہ حاصل کرنا تھا۔'' ۳۴

بنگالی نژاد ہندو مؤرخ سر جادوناتھ سرکار (م: ۱۹۵۸ء)، جو اپنے تعصبات پر بمشکل پردہ ڈال پاتا ہے، اورنگ زیب سے دشمنی کے جذبات رکھنے کے باوجود اس کی تائید کرتا ہے:

''اورنگ زیب نے رحم دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تعاقب کی ممانعت کردی، اور کہا کہ: انسانی جانوں کی یہ معافی خالق کے حضور اس کی طرف سے زکواۃ تھی۔...'' ۳۳

تاہم جادوناتھ سرکار ڈنک مارے بغیر نہیں رہا: ''لیکن ظاہر ہے اورنگ زیب کے عقیدے کے مطابق خالق صرف مسلمانوں کا خالق ہے۔ شہزادے نے افسروں کو حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان جو میدان میں نظر آئے اس کی جان بخش دی جائے اور دشمن کے کیمپ میں مسلمانوں کے مال اور عصمت کو بچایا جائے۔ لیکن ہندو اس کے دائرۂ ترحم سے باہر تھے۔''

جادوناتھ سرکار کی معلومات کا ذریعہ مشتبہ ہے۔ اورنگ زیب کا اپنا مکتوب اصل بات سامنے لا رہا ہے کہ اس کا حکم مسلمانوں کے لئے مخصوص نہ تھا۔ بلکہ وہ جسونت سنگھ اور اس کے لشکریوں کا عمومی ذکر کرتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں: ''میں بڑی آسانی سے جسونت سنگھ اور اس کے لشکریوں کا تعاقب کر کے ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔...''

اس کے خط سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کے مقابل فوج جسونت سنگھ کے کمان میں تھی کیونکہ برنیئے کے بقول قاسم خان لڑائی چھڑتے ہی میدانِ جنگ سے بھاگ گیا تھا۔ چنانچہ رہ جانے

والی فوج، سنگھ کے کمان میں لڑ رہی تھی۔ شجاع کے نام مراد بخش کے خط سے واضح ہوتا ہے کہ کون سے دستے کس کی کمان میں تھے، بلاشبہ سادات، راجپوت، افغان اور مغل سبھی دستوں کی قیادت جسونت سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔[۳۴] اسے اگر اورنگ زیب کے خط کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو کوئی ابہام باقی نہیں رہتا اور جادوناتھ سرکار والی تاریخ نویسی کے چہرے سے نقاب اُتر جاتا ہے۔ معاملہ کچھ بھی ہو، جادوناتھ سرکار کو یاد نہیں رہتا کہ جسونت سنگھ نے اورنگ زیب کو باپ کے پاس جانے سے روکتے ہوئے ہتک آمیز رویہ بھی اپنایا اور داراشکوہ کی طرف سے اس سے عملاً لڑنے بھی آیا۔ اگر اورنگ زیب واقعی متعصب اور سنگدل انسان تھا تو اس کا جسونت کو چھوڑ دینا جبکہ وہ کافر بھی تھا اور شہزادے کے سامنے بے بس ہو گیا تھا، اور بعد میں اسے اہم انتظامی عہدوں پر فائز کرنا تو کچھ اور ہی ظاہر کر رہا ہے۔ لیکن متعصب دل فیاضیوں کو تسلیم نہیں کیا کرتا، بلکہ یہ ہمیشہ دلی ارادوں اور افعال و واقعات کا من پسند مطلب ہی نکالتا ہے۔

اس دوران میں شاہ جہاں کو حالات کی سنگینی کا احساس ہو گیا کہ پانسہ پلٹ گیا ہے۔ اس نے دارا کو سمجھایا کہ بھائیوں کو آگرہ آنے دے، لیکن اُس نے التفات نہ دکھائی۔ ہندو اپنے خوابوں کی تکمیل کی خاطر اس پر اپنی گرفت مضبوط کئے جا رہے تھے۔ اس موقع پر اورنگ زیب پھر کوشش کرتا ہے کہ باپ کو قائل کرے کہ وہ خود مداخلت کرے اور اس طرح خوں ریزی کے خطرے کو ٹال دے۔ اس نے شاہ جہاں کو دو خط لکھے۔ پہلا خط جعفر خان لے کر گیا۔ لیکن اس وقت تک شاہ جہاں اپنا سارا وزن داراشکوہ کے پلڑے میں ڈال چکا تھا۔ اس نے خط کے مندرجات پر توجہ ہی نہ دی، بلکہ دارا کی فوجوں کو رخصت کرتے ان کی کامیابی کے لئے خصوصی دعا کی۔ اورنگ زیب نے دوسرا خط اس وقت لکھا جب داراشکوہ کا لشکر جز اردھول پور پہنچ گیا تھا۔ وہ پھر باپ سے گزارش کر رہا تھا کہ داراشکوہ کو اس کے خلاف جنگ سے روکے، بصورتِ دیگر داراشکوہ

کے لئے شکست سے بچنا ممکن نہیں ہوگا۔[۳۵]

وہی ہوا کہ داراشکوہ نے شکست کھائی اور آگرہ کی طرف بھاگا۔ وہ اپنی زندگی کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، لیکن شاہ جہاں کی اس بڑے بیٹے کی محبت میں بے قرار تھا۔ اس نے سونے جواہرات سے داراشکوہ کی مدد کی۔ مزید یہ کہ اس نے صوبوں کے گورنروں کو لکھا کہ داراشکوہ کی مدد کو پہنچیں۔ لیکن قسمت کی بازی پلٹی اور شاہ جہاں اورنگ زیب سے ملاقات پر مجبور ہوا۔ اس نے آمادگی کی اطلاع دینے کے لئے فضل خان اور سیّد ہدایت اللہ کو اورنگ زیب کے پاس بھیجا۔ اورنگ زیب نے ہامی بھر لی کہ جنگی صورتِ حال معمول پر آتے ہی وہ باپ سے ملنے پہنچ جائے گا۔

شاہ جہاں کچھ انتظار کر سکتا تھا لیکن اب اسے ملاقات کی بے چینی لگی ہوئی تھی۔ اس سے اورنگ زیب کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بج گئی۔ اگر وہ قلعہ میں داخل ہوتے ہی قتل کر دیا گیا تو؟ شاہ جہاں کے نام اس کے ایک خط میں ان اندیشوں کا اظہار موجود ہے:

> ''میری انسانی کمزوریاں اور میرے اندیشے اور شبہات جو میرے ذہن پر یورش کر رہے ہیں، مجھے حوصلہ نہیں دے رہے کہ میں اعلیٰ حضرت کی قدم بوسی کی سعادت حاصل کروں ... تاہم اگر میری ذاتی تسلّی کی خاطر آپ میرے کچھ دستوں کو قلعے میں داخل ہونے اور دروازوں پر متعین ہونے کی اجازت مرحمت فرما دیں ... تو میں ضرور حاضر ہوں گا اور آپ کے پائے مبارک چوم کر معذرت خواہی کروں گا۔''[۳۶]

اورنگ زیب کے اندیشے بلاوجہ نہ تھے۔ ماضی میں تو اس کی بار بار درخواستوں پر بھی باپ

ملاقات پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا، کیونکہ وہ پوری طرح داراشکوہ کے ساتھ تھا۔ اب وہ خط در خط لکھ کر ملاقات کے لئے اتنا بے چین کیوں ہو رہا ہے؟ یہاں سینیورا منہوچی کی گواہی، جو دل و جان سے داراشکوہ کا حمایتی تھا، سمور گڑھ میں اس کے فوج کے ساتھ تھا، قابل توجہ ہے۔ منہوچی کہتا ہے کہ شاہ جہاں، دراصل اورنگ زیب کو قوی الاعضاء تاتاری، قلمک اور اُزبک خواتین کے ہاتھوں قتل کرانا چاہتا تھا۔

فرانسیسی سیاح برنیئے نے بھی اپنے سفرنامے میں ایسی ہی بات لکھی ہے۔ محل کے اندر کی بات اورنگ زیب کی چھوٹی بہن روشن آراء جان گئی تھی اور اسی نے بھانڈا پھوڑا اور بھائی کو باپ کے ارادوں سے خبردار کر دیا۔ اورنگ زیب کو یقین ہو گیا کہ جب تک باپ کے ہاتھ میں استعمال کے لئے طاقت اور وسائل ہیں، وہ داراشکوہ کی معاونت سے باز نہیں آئے گا۔ دانش اور تجربہ تقاضا کر رہے تھے کہ وہ قلعہ آگرہ کو شاہ جہاں کے آدمیوں سے خالی کرانے کا مطالبہ کرے۔ یہ ساری باتیں جان کر بھی سیکولر حضرات اورنگ زیب کو ظلم و زیادتی کا الزام دیتے ہیں۔ اورنگ زیب کی جگہ کوئی بھی دوسرا شخص ایسے حالات میں کیا کرتا؟

جی ہاں! اورنگ زیب نے آگرہ کا قلعہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن اس کے باوجود کہ شاہ جہاں نے اس کے لئے سخت مخاصمانہ صورتِ حال پیدا کر دی تھی، اس نے باپ سے نرمی اور مہربانی کا سلوک روا رکھا۔ اس سے کم تر اخلاق والا اُس کا کوئی دوسرا بھائی، اس کیفیت کو انتقام کا بہانہ بنا لیتا۔

برنیئے اس واقعے کے تذکرے میں اورنگ زیب کے رویے کو باپ کے حق میں غیر پسرانہ اور ظالمانہ قرار دیتا ہے۔ لیکن وہ واقعاتِ ماسبق جو اس حادثے کا سبب بنے، بیان نہیں کرتا۔ سچ یہ ہے کہ جب شاہ جہاں نے شہد میں گھلے اندازِ گفتگو سے اورنگ زیب سے ملنے کی خواہش کا اظہار

کیا: زُود آئی، دلِ تنگ مارا مانُوسِ جاں باش، یعنی جلد آ جا، اور میرے بھینچے ہوئے دل کے لئے راحتِ جان بن جا۔

لیکن قلعہ میں اورنگ زیب کے جانے سے پہلے ہی اس کے ماموں شائستہ خان اور شیخ میر اسے روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ جس واقعے نے حتمی فیصلہ کرنے میں مدد دی، وہ ناہر دل خان چیلہ نامی شخص کا پکڑا جانا تھا، جو شاہ جہاں کا خط دارا کے پاس لے جا رہا تھا۔ بادشاہ نے دارا شکوہ سے دارالحکومت میں رُکنے کے لیے کہا تھا کہ سیم وزر اور فوجوں کی کوئی کمی نہیں: ''میں یہ معاملہ یہیں ختم کر دوں گا۔'' بات واضح ہے کہ اس کے ارادے اورنگ زیب کو قتل کرنے کے تھے۔

والی کابل مہابت خان کے نام خط میں شاہ جہاں، دارا شکوہ کے لئے محبت کے گہرے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ وہ بیٹے دارا شکوہ کو 'دارائے سن' (میرا دارا) کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ اگرچہ سرکاری مکتوب تھا، خصوصی حالات میں لکھا گیا تھا اور اس طرح کے اظہارِ محبت کے لئے موزوں نہ تھا۔ لیکن شاہ جہاں دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔

برنیئے کو اس پورے قصے پر اعتراض ہے۔ یہاں بھی اس کا سارا بیان سوائے قیاس کے کچھ نہیں، جس میں تاریخ نویسی والی کوئی خوبی نہیں۔ کہتا ہے: ''بہت سے 'ذہین لوگ' ان الزامات کی صداقت کا انکار کرتے ہیں کہ یہ خط جسے اس انداز سے عام کیا گیا، لوگوں کو دھوکا دینے کی ایک کوشش تھی ....'' لیکن برنیئے اُن ''ذہین لوگوں'' میں سے کسی ایک کا بھی نام نہیں بتاتا جنہیں وہ جانتا ہو۔

تیورنیا (Tavernier) شاہ جہاں کا خط پکڑے جانے کا ذکر ہی نہیں کرتا، جس نے باپ سے ملنے کے ضمن میں اس کے ارادے بدل ڈالے۔ اس کے خیال میں اورنگ زیب طاقت کے میدان کا کھلاڑی ہے، بہت سرد مزاج اور انتہائی چالاک فتنہ پرداز۔ لیکن یہ کہ وہ ایک بیٹا بھی

تھا، ایک بندۂ مومن بھی اور آخر کو انسان تھا۔ یہ سب پہلو برنیئے کے نزدیک قابل توجہ اُمور ہیں ہی نہیں۔

ان خطوط کی بناء پر اورنگ زیب کو یقین ہو گیا تھا کہ باپ اسے قتل کر دے گا۔ چنانچہ اس کا فیصلہ تھا کہ دارا شکوہ کی رخصتی لازم ہے۔ اس کا تختِ دہلی کا ہندو پسند دعوے دار کے طور پر موجود ہونا، سلطنت میں فتنہ و فساد کا باعث تھا۔ بلکہ جنوبی ایشیا میں مسلم اقتدار کو ختم کرنے کا باعث بن سکتا تھا۔ اس طرح مجبور ہو کر اس نے شاہ جہاں کا ذاتی سٹاف اس کے پاس سے ہٹا دیا، اور اس کے گرد ایک نیا انتظامی ڈھانچا قائم کر دیا۔ یہاں اورنگ زیب کا ایک خط جو اس کے مجموعۂ مکاتیب میں موجود ہے، لازماً زیرِ نظر رہنا چاہیے:

> ''میں اعلیٰ حضرت سے بار بار درخواست کرتا ہوں کہ یہ آگ بھڑکانے والے خطوط نہ لکھے جائیں... اب میں بے بس ہو گیا ہوں۔ میں ان فتنہ پرداز خواجہ سراؤں کو آپ کے سٹاف سے فارغ کر رہا ہوں .... میں کئی دفعہ یہ یقین دہانی بھی کرا چکا ہوں کہ آگرہ کی طرف بڑھتے ہوئے میری ذرا بھی خواہش نہیں تھی کہ میں شاہِ اسلام سے تخت و تاج چھین لوں۔ میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں کہ ایسا بُرا خیال میرے ذہن میں آیا ہی نہیں۔
>
> ''آپ کی علالت کے ابتدائی ایام میں جب بڑے شہزادہ نے، جس میں ایک مسلمان کے شریفانہ کردار کا ذرہ بھر نقش موجود نہیں، اقتدار ہاتھ میں لیا اور الحاد اور بے دینی کا علم بلند کیا تو میں نے اسے اپنی اسلامی ذمہ داری سمجھا کہ اسے مسندِ اقتدار سے اُتار پھینکوں۔ چونکہ آپ عالی وقار کا ایک ہی

جانب جھکاؤ رہا، حالات کی سنگینی کا احساس نہ کر پائے اور بڑے شہزادے کو بے دینی پھیلانے کی آزادی دیے رکھی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اس کے خلاف جہاد کروں۔''

وہ تشویشناک صورتِ حال کیا تھی جو اورنگ زیب کے ذہن کو پریشان کر رہی تھی؟ یہ ہندستان نامی غیر مسلم سمندر میں مسلم اُمہ کے مستقبل کا سوال تھا۔ مسلمان ایک دوسرا اکبر نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ دارا شکوہ کی تخت نشینی سوسائٹی اور مملکت کے اسلامی خدوخال مٹا کر رکھ دیتی۔ بلکہ مملکت، مسلم حمایت سے محروم ہو جاتی، جو اس کے وجود اور تسلسل کا بڑا ذریعہ تھا۔ حکیم الامت اقبال نے تقریباً یہی بات فرمائی تھی۔

تخمِ الحاد ے کہ اکبر پرورید
باز اندر فطرتِ دارا رمید

اکبر نے الحاد کا جو بیج بویا وہ دارا کی شکل میں دوبارہ پھوٹ پڑا۔

اورنگ زیب کے ارادوں کا پتہ شاہ جہاں کے نام اس کے ایک اور خط سے بھی ہوتا ہے:

''جب تک طاقت اور اختیار آپ کے مبارک ہاتھوں میں رہا، آپ کی اطاعت مجھ پر لازم تھی۔ اللہ بزرگ و برتر گواہ ہے کہ میں نے اپنی حدود سے کبھی تجاوز نہیں کیا۔ لیکن جب آنجناب بیمار پڑ گئے تو شہزادے (دارا) نے آپ کے اختیارات سلب کر لیے۔ اس نے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین کی جگہ ہندوؤں کا بت پرستانہ مذہب پھیلانا شروع کر دیا، جس سے سلطنت میں بے چینی پھیل گئی۔

''اپنے آپ کو حقیقی جانشین سمجھ کر اُس دارا نے آپ کو بادشاہی سے معزول کر دیا، جس کا میں نے گزشتہ خطوط میں ذکر کیا.... چنانچہ میں برہان پور سے چل پڑا کہ کہیں یومِ آخرت اللہ تعالیٰ مجھے ذمہ دار نہ ٹھہرائے کہ میں نے فساد کو کیوں نہیں دبایا۔

دوسرے خطوط کی طرح اس خط میں بھی اورنگ زیب اپنی کامیابی کو اللہ کی عطا کردہ بتاتا ہے، جو اُس کے مومن بندوں کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ باپ سے پوچھتا ہے کہ اگر آپ کی مدد سے دارا شکوہ کامیاب ہو جاتا ہے، تو کیا صورتِ حال بن جاتی؟ کیا اس سے مسلمانوں پر تباہی نہ آجاتی اور دنیا بے نور نہ ہو جاتی؟ اس کے باوجود باپ کے لئے محبت اور احترام کا جذبہ اس کے دل میں موجزن رہا۔ اس خط میں وہ لکھتا ہے:

''ان حالات میں اللہ تعالیٰ کی عنایات پر شکر گزار ہوں جو مجھ پر ہوئیں۔ آپ نے میری تعلیم و تربیت اور نگہداشت کے لئے جو کچھ کیا اس پر اظہارِ تشکر بھی میرے لئے ممکن نہیں۔ میں کسی صورت اس سعادت سے محروم نہیں ہونا چاہتا، نہ میں اپنے فرائض سے کوتاہی کا ارتکاب گوارا کر سکتا ہوں۔ نہ میں اس مختصر عرصۂ حیات کی خاطر اپنے آپ کو اجازت دوں گا کہ آپ کے احساسات کو ذرا بھی ٹھیس پہنچ پائے۔ جو کچھ پیش آیا وہ اللہ کی مشیت تھی اور اسی میں قوم اور سلطنت کے لئے خیر اور بھلائی ہے۔''

یہ ایک عظیم بادشاہ کا اپنے ''قیدی'' باپ کے نام خط ہے۔ اس میں پسرانہ جذبات ہیں، وہ باپ کو تسلی دے رہا ہے کہ اللہ کی مشیت اور رضا کے سامنے سر جھکا لے اور دل میلا نہ کرے۔ فی الاصل یہ حالات کو معمول پر لانے اور مصالحت کی ایک پیشکش تھی، تاکہ محبت اور اعتماد کی فضا

بحال ہو۔ اس سے اسلام کے لئے اس کی گہری محبت کا اظہار بھی ہوتا ہے اور یہ کہ اسے مسلم اُمت اور مملکت کے متعلق کیا اندیشے لاحق تھے ان سے بھی آگاہی ہوتی ہے شاہ جہاں جو ہمیشہ ہی ایک مشکل باپ بنا رہا، آمادہ نہیں ہو رہا تھا کہ نظام کی اصلاح ہو اور معاملات پھر سے ٹھیک ہو جائیں۔

انسان جب اُن حالات کو دیکھتا ہے جن میں اورنگ زیب پھنس چکا تھا اور ساری موجود شہادتوں کا جائزہ لیتا ہے تو اُسے حیرت ہوتی ہے کہ آخر اُس نے باپ سے وہ کیا بُرا سلوک کیا، جس کا الزام اُسے ہندو، یورپی اور سیکولر مؤرخین اور تجزیہ نگار دیتے ہیں۔

طرفہ تماشہ یہ ہے کہ تخت شاہی سے تو شاہ جہاں کو بڑے بیٹے دارا شکوہ نے اُتارا تھا، نہ کہ اورنگ زیب نے، جو آخری گھڑی تک باپ کے احترام میں دوسرے بھائیوں کے برعکس تخت پر بیٹھنے سے انکار کرتا رہا۔ اگر اس نے قلعہ میں داخلے کے مقامات پر محافظ بٹھا دیے تھے یا شاہ جہاں کو گھیرے رکھنے والے خواجہ سراؤں کو نکال دیا تھا، تو اس میں کون سی ایسی بُری بات تھی؟ سیکولر دانش ور شاید یہی سمجھتے ہیں کہ آگرہ کا قلعہ بھی لاہور یا انک قلعوں کی طرح کا کوئی قید خانہ تھا۔ حقیقت اس سے بالکل مختلف تھی۔ سچ یہ ہے کہ قلعہ کے اندر موجود شاہی محل مرتے دم تک شاہ جہاں کے قبضہ میں رہا۔ برنیئے کا اظہارِ عداوت و خصومت اُسے یہ ماننے کی اجازت دے دیتا ہے کہ اگرچہ شاہ جہاں کی رہائش گاہ پر محافظ بٹھا دیے گئے تھے، لیکن اورنگ زیب ہمیشہ باپ سے عزت و احترام سے پیش آیا اور اُسے ''عیش و تنعم اور توقیر سے نوازتا رہا۔'' برنیئے کی گواہی یہ بھی ہے کہ شاہ جہاں نے جو کچھ مانگا اورنگ زیب نے مہیا کر دیا: ''اُس نے اُسے تحائف سے لاد دیا۔ ایک فال گر کاہن کی طرح اُس سے مشورے لیتا رہا اور اس کے باپ کے نام لکھے گئے خطوط سے فرض شناسی اور اطاعت گزاری کا اظہار ہوتا ہے۔''

اورنگ زیب نے ان جذبات اور فیاض رویّوں کا برتاؤ اس والد کے ساتھ کیا، جس نے جواب میں پدرانہ شفقت سے ہاتھ اُٹھا لیے تھے، جو اُسے ختم کرنے کے لئے پہلے داراشکوہ سے ملا رہا، پھر خود قلعہ میں اس کو موت کے گھاٹ اُتارنے کی منصوبہ بندی کی، بلکہ مُراد کو بھی اُکسایا کہ اُسے قتل کردے۔ شاہ جہاں کا مراد کے نام خفیہ خط جسے اورنگ زیب کے چست اور بیدار خفیہ کاروں نے راستے میں اُچک لیا، واقعی ایک متعصب اور مایوس ذہن کی پیداوار ہے۔ پوری سلطنت مراد پر نچھاور کر کے وہ اُسے شبہ دے رہا ہے کہ اورنگ زیب کو کھانے کی دعوت میں بلا کر قتل کردے۔ خط کے الفاظ خون منجمد کردینے والے ہیں:

''بادشاہِ کل ہندوستان باطیبِ نفس وتوئی ضمیر بہ آں فرزند سعادت پیوند حوالہ نمودہ ایم۔ برادر زادہ را بہانہ ضیافت بہ خانۂ خود طلب داشتہ کار۔...''

شاہ جہاں نے یہ سازشی انداز کیوں اختیار کیا؟ ایک پیچیدہ سوال ہے۔ شاید یہ ایک غیر متوازن نفسیات کا مسئلہ ہے۔ بہرکیف اورنگ زیب نے ہر پیمانے سے اپنے آپ کو عظیم ترین مغل حکمران ثابت کیا کہ وہ خود اپنے نام کی طرح تختِ شاہی میں جڑا ہوا ہیرا دکھائی دیتا ہے۔ باپ کے متعلق اس کے خدشات بے بنیاد نہ تھے۔ اس امر کے کافی شواہد موجود ہیں کہ باپ کی نگرانی کا فیصلہ اس نے جوابی طور پر خود حفاظتی کے پیشِ نظر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بقول برنیئے جب اورنگ زیب ابتدائے حکومت میں سخت بیمار پڑا تو اس نے اپنے بیٹے سلطان معظم کو وصیت کی کہ اس کی وفات کی صورت میں وہ اپنے دادا (شاہجہاں) پر سے نقل وحرکت کی ساری پابندیاں اُٹھادے۔

برنیئے کا مسئلہ اس کا موضوعی مفروضہ (thesis) ہے، جس میں وہ اُلجھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کبھار سچ اس کی نوک قلم پر آجاتا ہے، لیکن پھر اس کا وہی مفروضہ اُسے کھینچ گھسیٹ کر کیچڑ میں لت پت کر دیتا ہے۔ اب وہ اپنی گزشتہ بات بھول کر اورنگ زیب کے خلاف بے تکی ہانکنے لگتا ہے۔ شومئی قسمت اُس کے پاس اپنی بات ثابت کرنے کے لئے کچھ نہیں۔ گو وہ پوری کوشش کر کے بات بنالیتا ہے، تاکہ وہ اورنگ زیب کے منہ پر ذلت اور رسوائی کے داغ ثبت کر سکے۔ لیکن اپنی ہی ایجاد کردہ خاک میں اپنے آپ کو لتھڑنے کے سوا اُسے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ایسی ہر کوشش کے بعد اورنگ زیب کا چہرہ کچھ اور نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔

اپنے ایک خط میں، جس کے متعلق برنیئے کا دعویٰ ہے کہ اس نے خود لکھا ہے، اورنگ زیب کھل کر باپ سے ایک متنازع فیہ بات کرتا ہے۔ برنیئے کے مطابق اس قضیے میں اورنگ زیب عام مغل رواج کے مطابق میت کی جائیداد شاہی خزانے کے لئے ضبط کرنے کے خلاف ہے اور کہتا ہے: ''بے شک یہ طریقہ سود مند ضرور ہے، لیکن کیا اس میں موجود بے انصافی اور ظلم کا ہم انکار کر سکتے ہیں؟''

خط کے مندرجات بتاتے ہیں کہ شاہجہاں نہ صرف مرنے والوں کی جائیداد ضبط کرنے کی تجویز دے رہا ہے، بلکہ سلطنت کی جغرافیائی حدود اور اموال میں اضافہ کی تلقین بھی کرتا ہے۔ مگر اورنگ زیب کا اسلامی ضمیر یہ باتیں گوارا نہیں کرتا۔ سلطنت کی توسیع سے بھی وہ انکاری ہے۔ اس کا خیال ہے: ''عظیم فاتح ہمیشہ عظیم بادشاہ ثابت نہیں ہوئے۔ واقعی عظیم حکمران وہ ہے جو اپنی زندگی کا بڑا مقصد یہ بنائے کہ اپنی رعیت پر عادلانہ حکومت کرنی ہے''...

اپنے بارے میں شاہ جہاں کا منفی تأثر زائل کرنے کے لیے وہ کہتا ہے: ''جیسا آپ کا گمان ہے،

تخت پر بیٹھنے کے بعد میں مغرور اور گستاخ نہیں ہوگیا۔ آپ کا چالیس سالہ تجربہ آپ کو بتانے کے لئے کافی ہے کہ تاج شاہی کتنا بوجھل زیور ہے اور عوام کی نظروں سے بچتے وقت حکمران کتنا دُکھی اور مغموم ہوتا ہے۔'' ۵۱

قطع نظر اس کے کہ یہ خط اورنگ زیب کے خلاف بدخواہوں کے اُن الزامات کو دفن کر دیتا ہے کہ وہ تخت سنبھالنے کے بعد باپ کو قید کرنے اور اس کے ساتھ زیادتیاں کرنے کا مرتکب ہوا۔ تصویر یہ بنائی جاتی ہے کہ باپ جیل میں سڑ رہا ہے، کوئی اُس سے بات نہیں کرسکتا، نہ مل پاتا ہے، واقعات کے اعتبار سے قطعاً نادرست ہے۔ مذکورہ خط اورنگ زیب کی صحیح شخصیت بھی سامنے لاتا ہے۔ باپ بیٹا ایک دوسرے سے صلاح مشورہ کرتے پائے جاتے ہیں۔ جہاں وہ اپنے باپ سے اختلاف کرتا ہے، وہاں دلیل اور بُرہان ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے دوٹوک فیصلے کیے لیکن وہ نہ بدخُو تھا اور نہ ظالم۔ اس کے بیان سے صرف اسلامی جوہر آشکارا ہورہا ہے، جسے اپنی رعیت کے بہبود کی فکر لاحق تھی اور اس کا یہ عزم تھا کہ وہ عوام کو عدل وانصاف دے گا۔

برنیئے جس طرح اس خط کا اعادہ کرتا ہے، وہ اورنگ زیب کو ایک ایسے بیٹے کے طور پر قطعاً پیش نہیں کرتا، جو اپنے والد سے خطاب میں بہت محتاط اور مؤدب ہے۔ اس کے برعکس ''رُقعاتِ عالمگیر'' ہمارے ذہنوں میں ایسے بیٹے کا تصور بٹھاتا ہے جو والد کے احترام کا بے حد خیال رکھتا اور اپنے بیان میں بیچ بیچ میں گہری احترامی کیفیت اور اطاعت کے الفاظ استعمال کرتا جاتا ہے۔ مثلاً وہ اکثر و بیشتر باپ کو خطاب کرتے ہوئے ''پیر و مرشد''، ''قبلہ وکعبہ''، ''قبلۂ دین و دنیا''، ''قبلۂ جہاں و جہاں سلامت''، ''اعلیٰ حضرت''، ''مرشدِ کامل سلامت'' جیسے القاب استعمال کرتا ہے۔ جبکہ اپنی ذات کے لئے ''مرید فدوی'' اور ''مرید عقیدت کیش'' جیسے الفاظ ہی مناسب سمجھتا ہے۔

چنانچہ قواعد کو تجزیے کی سان پر چڑھا کر دیکھیں تو برنیئے کی تحریر تضاد بیانی کا مرقع ہے، جس میں مذکورہ القابات جگہ نہیں پاتے، جبکہ یہ اورنگ زیب کا اپنے والد کے لیے مخصوص طرزِ تحریر ہے۔ برنیئے کا مقصد ایک ہی لگتا ہے کہ باپ کے ضمن میں اورنگ زیب کی سختیوں کے متعلق اپنے مفروضے کو درست ثابت کردے۔ حقیقی تاریخ نویسی کے معاملے میں برنیئے شہادت کے بارے میں محتاط نہیں ہے، وہ واقعات کی توضیحی تشکیل میں مصروف رہتا ہے۔ اور حقائق کے بجائے اپنے ذاتی تصورات سے سارا بیانیہ مرتب کرتا ہے۔ اس کا بیان کو واقعات کی من مانی تشریح تو کہا جا سکتا ہے، لیکن اسے وہ ٹھوس شہادت نہیں کہا جا سکتا کہ جس پر ایک راست مقدمے کی بنیاد اٹھائی جا سکے۔

ارتداد کا راستہ روکنا

برنیئے کی اطلاع ہے کہ داراشکوہ کی موت علما کی ایک مجلس کے اجتماعی فیصلے یا فتوے کے نتیجے میں ہوئی تھی، نہ کہ اورنگ زیب کے شاہی فرمان کے نتیجے میں[۲۵] علما کی مخاصمت کی وجہ ظاہر ہے داراشکوہ کے کافرانہ عقائد تھے، جن کا وہ اپنے آغازِ جوانی سے برملا اظہار کر رہا تھا۔ اس نے سات کتابیں لکھیں جن میں دو اشتراک سے لکھی گئیں، نیز اُپنشد کا فارسی ترجمہ کیا۔ چنانچہ اشرافیہ کی اکثریت، علمائے کرام اور عوام الناس میں اس کے کفریہ عقائد کا چرچا تھا۔

جس چیز نے داراشکوہ کے خلاف مخالفانہ جذبات کو زبان بخشی اور اس مزاحمت کو اتحاد میں پرویا، وہ داراشکوہ کی مسلم ہند کے تخت پر بیٹھنے کی خواہش تھی۔ یہ ایک وسیع اتحاد تھا، ہدف یہ تھا کہ اکبر کا الحادی دور دوبارہ نہ آنے پائے۔ مجدّد الف ثانی کی تحریک نے اورنگ زیب کو مجبور کیا کہ وہ داراشکوہ کے خلاف فوجی محاذ پر لیڈر کا کردار ادا کرے۔ شاید کم لوگوں کو علم ہو کہ اورنگ زیب مذکورہ تحریک کا

نمایاں کارکن تھا، جس نے حضرت احمد سرہندیؒ مجدد الف ثانی کے فرزند ارجمند اور خلیفہ خواجہ معصومؒ کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت کی تھی۔ ۵۳

برنیئے کا مدیر کانسٹیبل (Constable) منہوچی کے حوالے سے بتاتا ہے: ''عیسائی جذبات جن کے ذریعہ مشنری پادریوں نے کوشش کر کے اسے (یعنی داراکو) سرگرم کیا تھا، اس کی زندگی کے آخری لمحات میں بیدار ہو گئے تھے۔'' موت سے پہلے اُسے کہتے سنا گیا:

''محمدؐ مارہ ملکو شد، ابن اللہ مریم می باشید [محمدؐ مجھے موت دے رہا ہے، جبکہ ابن اللہ اور مریم مجھے نجات دلائیں گے]'' ۵۵

ہمیں یقین نہیں کہ دارا کا سر اورنگ زیب کو دکھایا گیا تھا یا نہیں۔ برنیئے کا بیان ہے کہ سر بادشاہ کے پاس لایا گیا۔ اس نے پانی منگایا، سر دھویا اور چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ بھائی کے انجام پر رو دیا اور کہا: ''آہ، بدبخت! یہ منظر میری آنکھوں کو مزید اذیت نہ دے۔ یہ سر لے جاؤ اور مقبرۂ ہمایوں میں دفن کر دو۔'' ۵۶ اگر اورنگ زیب اتنا ہی ظالم اور سخت گیر تھا، جیسے کہ الزام دیا جاتا ہے تو خود اپنے بھائی کے انجام پر وہ رو کیوں رہا تھا؟ اور سب کو چھوڑ کر اس نے کٹا ہوا سر خود کیوں دھویا؟ کیا ظالم اور سنگ دل انسان کا رویہ ایسا ہی ہوتا ہے؟

داراشکوہ مرتد تھا، جو ہندو مدد اور عیسائی مشنریوں، تجار اور کرائے کے قاتلوں کی درپردہ تائید حاصل کر کے لوگوں کی اسلامی روح کچلنا چاہتا تھا۔ اورنگ زیب نے مسلم عوام کی مضبوط حمایت کے ذریعے اس کا مقابلہ کیا۔ تاہم دارا آخر بھائی تھا۔ وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے والے شہزادے کے انجام پر فطری طور پر آبدیدہ تھا، لیکن ان احساسات کے علی الرغم اُسے کچھ اور کرنا پڑا۔ کیونکہ نہ قانونِ شرع کا کوئی ضابطہ اجازت دے رہا تھا اور نہ سلطنت کی سلامتی کے حوالے

سے یہ بات قابل قبول تھی کہ کفر اور ارتداد کو سزا دیے بغیر بچ جانے دیا جاتا۔ جس حوالے سے بھی دیکھیں، داراشکوہ مسلم تشخص کے تزویراتی (strategic) تقاضوں کے لئے خطرہ بن گیا تھا۔ وہ مسلمان جو اقلیت میں ہونے کے باوجود ہندستان کے حکمران تھے۔ یہاں پر ایک اور حیرت انگیز بات پیش نظر رہنی چاہیے، اور وہ یہ کہ اورنگ زیب سے پہلے بھی برادر کشی کی جنگیں ہوئیں اور خون بہائے گئے۔ ان سب میں صرف اورنگ زیب کو خنجر آزمائی کے لئے منتخب کرنا خاص مقصد اور ارادے کا پتہ دیتا ہے۔

قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ جانشینی کی جنگ داراشکوہ نے شروع کی تھی۔ عملاً آگرہ میں ڈیرہ ڈال کر باپ کو تنہا کر دیا تھا (برنیئے کہتا ہے ''قید کر دیا تھا'')۔ باپ کے جعلی دستخط کیے اور جسونت سنگھ کی کمان میں متحدہ افواج کو مسلمانوں سے لڑنے بھیجا۔ اس کے باوجود دارا تو بے قصور ہے، خوش اطوار ہے، اعلیٰ حسیات کا مالک اور عقل و دانش میں پورا صوفی بزرگ (''مرشدِ باصفا'') اور جانے کیا کیا ہے۔

شہزادہ مراد کے معاملہ میں بھی جھوٹ کی آمیزش ہے۔ اورنگ زیب نے اُسے بھی قتل نہیں کیا تھا۔ بلکہ دونوں بھائی داراشکوہ اور اس کے ہندو مشرکانہ عقائد کی ترویج کے خلاف صف آراء تھے۔ کئی مؤرخ بتاتے ہیں کہ مُراد مزاجاً تند و تیز تھا، شرابی اور خوشامد پسند تھا۔ اس پر اس کی جرأت اور حوصلہ مندی نے مہمیز لگائی۔ مفاد پرستوں کے گھیرے میں آ کر وہ جلد ہی ان کے سازشی چکروں میں آ گیا۔

اورنگ زیب سے معاہدہ کے نتیجہ میں اُسے کابل، لاہور، کشمیر، ملتان، بھکر، ٹھٹھہ سے لے کر خلیج اومان تک حکمرانی کے لئے وسیع علاقہ مل گیا تھا۔ لیکن اس کی ذہانت کے مقابلے میں اس کے

لمبے چوڑے ارادے اور حوصلے اسے لے ڈوبے۔ اورنگ زیب سے تعاون کے عہد و پیمان کو پسِ پشت ڈال کر اس نے شاہ جہاں سے تعاون کی پینگیں بڑھائیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ شاہ جہاں اورنگ زیب کے معاملات اُلجھے ہوئے ہیں اور معاملہ اورنگ زیب کی فتح کے بعد بھی ختم نہیں ہوگا، اپنے لئے خصوصی معافی کا خواست گار ہوا۔ شاہ جہاں نے بھی معذرت قبول کر کے معافی دے دی اور ساتھ ہی پورے مسلم ہندستان پر اس کا حقِ حکمرانی بھی تسلیم کر لیا۔ اہم ترین بات یہ تھی کہ یہاں پر بھی شاہ جہاں نے اُسے اورنگ زیب اور اس کے بیٹوں کے قتل کا مشورہ دیا۔

یہ وہ دن تھے جب آگرہ پر اورنگ زیب نے کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ اس نے زخمی مراد کو صحت یابی کے لئے پیچھے چھوڑا اور خود دارا شکوہ کے تعاقب میں چل پڑا، جو دہلی میں ڈیرہ جمائے بیٹھا تھا۔ لگتا ہے بیٹے (دارا) اور باپ کی یکجائی انہیں اورنگ زیب کے خلاف سازشوں کا موقع دے رہی تھی۔ اس موضوع پر اورنگ زیب کے خطوط کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ مراد کے خدشات جو اورنگ زیب کے ارادوں کے متعلق اس کے ذہن میں جنم لے سکتے تھے، ختم کرنے کے لئے اورنگ زیب نے اُسے دو سو گھوڑے اور بیس لاکھ روپیہ بھیجا۔ ساتھی ہی یہ یقین دہانی بھی کرا دی کہ دارا کا معاملے کا میابی سے سلجھاتے ہی اُسے واپس اپنے موعودہ علاقوں کی طرف جانے کی اجازت ہوگی۔

لیکن مطلق بادشاہی کے خواب مُراد کو اندھا کر چکے تھے۔ اس نے شاہجہاں کی بات مان لی اور تختِ شاہی پر اپنے دعوے کا اعلان کر دیا۔ اس صورتِ حال نے اورنگ زیب کو دکھی اور آزردہ کر دیا۔ اُسے نتائج کا خوف لاحق ہوگیا کیونکہ اب تین حریف اس کے سامنے تھے۔ چنانچہ اس نے خطرے کو سر اُبھارنے سے پہلے کچل دیا۔ مراد کو پکڑ کر گوالیار کے قلعے میں ڈال دیا۔ وہاں اسے

فیاضانہ عطیات سے نوازا گیا۔ اس کا گھرانہ اس کے ساتھ رہا اور اس کی خاص محبوبہ سرستی بائی اس کی دسترس میں رہی۔ لیکن مراد کی بگڑی نفسیات کو چین نہ آیا، اس نے فرار کی کوشش کی۔ اُسے اس وقت گرفتار کرلیا گیا جب وہ اپنی محبوبہ سے رخصت ہو رہا تھا۔ اورنگ زیب اُسے قتل کرسکتا تھا، لیکن اس نے اس کے خون سے ہاتھ رنگنا پسند نہ کیا۔ اُسے چار سال تک حفاظتی حراست میں رکھا گیا۔ یوں اُسے اچھی خاصی مہلت دی گئی کہ وہ کوئی فیصلہ کرسکے۔

تاہم جب اورنگ زیب سریر آرائے سلطنت ہوا تو قاضی کی عدالت میں مراد کے خلاف قصاص کا مقدمہ دائر ہوگیا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے اپنے وزیر سیّد علی نقی کو قتل کردیا تھا۔ یہ مقدمہ مقتول کے بیٹے کی استدعا پر قائم ہوا تھا۔ عدالت نے علی نقی کے بیٹے کو دیت قبول کرنے پر آمادہ کرنا چاہا، لیکن وہ قصاص (خون کے بدلے خون) پر اڑا رہا۔ اورنگ زیب کو اس کے خلاف قصاص کا مقدمہ اچھا نہ لگا۔ اس نے مقتول کے بیٹے کے سامنے ناراضی کا باقاعدہ اظہار کیا۔ خافی خان کا حوالہ میاں محمد نے دیا ہے کہ ''مغضوب النظر بادشاہ گردید'' (بادشاہ کی نظروں میں مغضوب ٹھہرا)۔[58] کچھ لوگ کہیں گے کہ اورنگ زیب قاضی کے فیصلے کو ختم کردیتا۔ ہاں، وہ کرسکتا تھا، لیکن اس نے نہیں کرنا تھا۔ بطور ایک مسلمان کے، جس کی نظر میں اہمیت شریعتِ الٰہی کی تھی اور عدالتی فیصلے کا احترام تھا، اسے معاملے سے دور ہی رہنا تھا۔ دل میں وہ بے شک کڑھتا رہتا اور غم سے گھلتا رہتا، لیکن اس نے قانون کو راستہ دینا تھا کہ وہ اپنا آپ منوائے۔

اورنگ زیب کو بدنام کرنے کے لئے برنیئر کہانی بُنتا ہے کہ مراد کے ساتھ دھوکا کیا گیا اور اسے دارا کو ختم کردینے کے بعد بادشاہ بنانے کا وعدہ پورا نہیں کیا گیا۔ برنیئر کی دلیل یہ ہے کہ جب دارا کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کے لئے اورنگ زیب کوشاں تھا تو اس نے مراد سے وعدہ کیا تھا کہ کامیابی کی صورت میں سلطنت اُسے ملے گی۔ لیکن یہاں پھر برنیئر کی زنبیل چالبازیوں سے

بھری ہوئی ہے اور وہ منہ بھر بھر کر جھوٹ بولتا ہے۔ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دستاویز سامنے نہیں لاتا۔ بس دونوں کے درمیان معاہدے کی اپنی تاویل بیان کرتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے چھوٹے بھائی کو ''اعلیٰ حضرت'' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔[۹] کیونکہ طے شدہ برتر مرتبے کا ادب ولحاظ اسے کرنا تھا۔

خوش قسمتی سے معاہدے کا متن اورنگ زیب کے مکاتیب کے مجموعے میں موجود ہے، جس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ دارا کا معاملہ نمٹانے کے بعد وہ اپنے تفویض شدہ علاقوں پر حقِ حکمرانی رکھے گا۔ معاہدے میں من جملہ یہ بھی ہے کہ دونوں بھائی اکٹھے رہیں گے۔ اورنگ زیب کے سامنے مراد نے جو اقرار کیا کہ اس ''دشمنِ دین و جان (دارا)''[۱۰] کو ختم کرنے کے بعد وہ ہمیشہ اور ہر جگہ اورنگ زیب کا ساتھ دے گا، اور وہ اپنے طے شدہ علاقوں کے علاوہ اور کچھ طلب نہیں کرے گا۔

مراد کے اس عہد کے جواب میں اورنگ زیب کہتا ہے کہ: جب تک ''عزیز تر از جان'' بھائی مخلص رہے گا، ہماری بخشش اور عنایات کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ہماری باہمی محبت اور توجہ اپنے مقاصد کے حصول اور دارالشکوہ لعین کا کانٹا نکال دینے کے بعد پہلے سے بھی زیادہ شدت سے جاری رہے گی۔ اس کے ایک سنجیدہ مقصد کے طور پر یہ عہد بھی اس میں درج ہے کہ: سیّد المرسلین محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین کے قیام اور سربلندی کے لئے اور دارالاسلام سے زندقہ والحاد کو اُکھاڑ پھینکنے کی کوشش جاری رہے گی۔ عہد نامے میں دو آیات قرآنی کا حوالہ موجود ہے، جن میں عہد کی پابندی پر زور ہے۔ دستاویز کا سرنامہ بھی کافی اہم ہے، یعنی: ''عہد نامہ کہ بوجہ التماس بادشاہ زادہ مراد بخش قلمی شد''[۱۱] کہ (عہد نامہ جو بادشاہ زادہ مراد بخش کی درخواست پر لکھا گیا)۔

اب دیکھیے، اس عہد نامے سے کیا بات سامنے آ رہی ہے:

- کہ پہلے ایک زبانی معاہدہ ہوا، جسے مُراد کی خواہش پر ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔
- کہ قول اورنگ زیب نے دیا، جبکہ مُراد کے ساتھ یہ عہد ہو رہا تھا۔

لیکن برنیئے بددیانتی سے اورنگ زیب کو قابلِ نفریں بنا کر دکھاتا ہے۔ وہ اپنا ہی ایک عہد نامہ ایجاد کرتا ہے اور پھر اس نقل کو اصل کر دکھاتا ہے جس کا الزام اورنگ زیب کے سر پر آتا ہے اور یوں اسے ''برائی کا مجسمہ'' بنا کر پیش کرتا ہے۔

دو شہادتیں ایسی ہیں کہ ان سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔ ایک کا ذکر ہو چکا، جس کا تعلق عہد نامہ سے ہے جو اورنگ زیب کو عہد کرنے والا بنا کر اُونچا مرتبہ دیتا ہے کہ وہ دوسروں پر عنایات کرتا ہے۔ اور ان دوسروں میں مراد بخش بھی شامل ہے۔ دوسری شہادت سمور گڑھ کی لڑائی کی کمان ہے۔ سٹینلے لین پول Medieaval India Under Mohammadan Rule (۱۷۱۲-۱۷۶۴) میں لکھتا ہے کہ اورنگ زیب نے لڑائی کی قیادت اپنے ہاتھ میں رکھی، پول کے الفاظ ہیں:

> ''کمان (قلب لشکر) اپنے ہاتھ میں رکھتے ہوئے۔ اس نے مُراد کو میسرہ (بائیں بازو) پر رکھا اور بہادر خان کو میمنہ (دائیں بازو) سونپا۔ اور ہراول دستے کے ساتھ اپنے بیٹے محمد کو بھیجا کہ وہ توپ خانے کے ساتھ رہے، جو حسبِ معمول سب سے اگلی صف میں تھا۔'' [۲۳]

لشکر کی یہ ترتیب بتاتی ہے کہ مرکزی کمان اورنگ زیب کے ہاتھ میں رہی، جبکہ مراد کو بائیں بازو میں اضافی کمک والی پوزیشن پر رکھا گیا۔

لڑائی کے بعد اورنگ زیب مُرادبخش اور دوسروں کو انعامات دیتا ہے۔ یہ عطیات قبول کر کے اور عہد نامہ کی درخواست دے کر مُراد اورنگ زیب کے مقابلے میں ثانوی حیثیت تسلیم کرتا ہے اور نہ کہ بادشاہ کی پوزیشن اختیار کرتا ہے، جیسا کہ برنیئے دعویٰ کرتا ہے۔

زیر بحث قضیے کے تین مفروضے

اب تک جو کچھ ہم عرض کر چکے ہیں، اس سے تین قابل ذکر مفروضے (thesies) سامنے آتے ہیں: یہ کہ اورنگ زیب ایک جابر حکمران، ایک بدکردار شخص اور ہوسِ اقتدار میں اندھا ہو جانے والا فرد ہے؛ یا یہ کہ اس نے حفاظت خود اختیاری کے تحت سب کچھ کیا، اور بدرجۂ آخر یہ کہ وہ ہندستان نامی ہندو سمندر میں مسلمانوں کا تشخص بحال رکھنا چاہتا تھا۔

۱۔ پہلے مفروضے کے حق میں کوئی ایسی تاریخی شہادت نہیں ملتی، جو اسے مجرم ثابت کر سکے۔

۲۔ دوسرے مفروضے کو تقویت دینے والا لوازمہ موجود ہے کہ خود حفاظتی کا محرک جذبہ بڑی حد تک کام کر رہا تھا؟

۳۔ تیسرے مفروضے کے دلائل بھی بے حد مضبوط ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کے اندیشے کہ مسلم تشخص کو بحال رکھنا ہے، اُس کی ساری زندگی سے عیاں ہے۔ مجدّدی تحریک کے ساتھ اُس کی دلی وابستگی اور تخت شاہی پر بیٹھنے کے بعد اسلامی شریعت کے اجرا کے لئے اس کی تگ و دو یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔

بظاہر دوسرے اور تیسرے مفروضے میں ٹکراؤ محسوس ہوتا ہے، لیکن گہرا جائزہ لیں تو یہ اختلاف اور ٹکراؤ ختم ہو جاتا ہے۔ ذیل کی وضاحت سے یہ بات سامنے آجائے گی:

اسلام میں بقائے زندگی مقاصد شریعت میں سے ہے۔ جان اہم اور قیمتی ہے، جسے بچانا لازم ہے۔ اورنگ زیب کے لیے سب سے پہلے اپنی جان کو لاحق خطرات سے نمٹنا ضروری تھا، جو بھائیوں اور باپ کی طرف سے اُسے لاحق تھے۔ اس کے بغیر وہ اسلام کی خدمت بھی نہ کر پاتا۔ اس کے بڑے بھائی داراشکوہ کو اصل نفرت اورنگ زیب کے دینی جذبے سے تھی۔ دارا نے جب اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا تو پھر اورنگ زیب اُس کی نظر میں صرف ایک باغی تھا۔

آخری دونوں مفروضے اتنے معقول ہیں کہ کسی رنگ آمیزی اور قینچی چلانے سے بھی ان کا بطلان نہیں ہوسکتا۔

ایک سوال جو قاری کا پیچھا نہیں چھوڑتا، یہ ہے کہ برنیئے جیسے مؤرخ، اورنگ زیب کے افعال میں خرابیاں اور خامیاں ہی کیوں دیکھ رہے ہیں۔ وہ سارے بُرے ارادے اُسی کی طرف کیوں منسوب کر دیتے ہیں۔ انہیں اورنگ زیب کا دینی میلان یاد نہیں رہتا۔ اس کا صاف کردار بھی وہ نہیں دیکھ پاتے، بلکہ اُسے ''فریب دہی کا لب لباب'' سمجھتے ہیں۔ ہم برنیئے کی عیسائیت کا ذکر پہلے بھی کر چکے ہیں اور یہ بھی کہ وہ اسلام سے کتنی نفرت کرتا تھا اور جو شخص اسلام کے دفاع میں کھڑا تھا وہ اُسے کتنا بُرا لگ رہا تھا۔

ایک دوسری وجہ قابلِ غور ہے۔ یہ بھی برنیئے کی عیسائیت ہی ہے، لیکن ذرا مختلف انداز میں۔ سینٹ پال م: ۶۷ء کی عیسائیت میں: مذہب کو دنیا سے رغبت نہیں ہونی چاہیے اور اقتدار کی ہر شکل سے اُسے دور رہنا چاہیے۔ جو کچھ آسمانی (ربّانی) ہے، اسے شیطانی دنیا سے بے تعلق ہونا چاہیے۔ مذہب اور زندگی کا یہ دوئی پسند تصور اپنے ہی پیمانے ایجاد کر دیتا ہے۔ پھر افراد اور ان کے اعمال اسی پیمانے پر جانچے جاتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں مذہب پر کاربند

ہے اور پھر بھی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ حضرات اسے فریب کا الزام دیتے ہیں کہ دنیا کی رغبت دیکھ کر تقویٰ باقی نہیں بچتا۔ یہ کردار ان کی نظروں میں مشتبہ ہے۔

جب برنیئے الزام لگاتا ہے کہ اورنگ زیب کی مذہبیت ''دکھاوا تھی، جو دراصل اس کے اندر نہ تھی'' اور یہ کہ اس کی زندگی ''مستقلاً سازشوں اور جعل واختراع'' سے عبارت تھی، تو ساری بات سمجھ آجاتی ہے۔ اس کے خیال میں اورنگ زیب محض نمائشی انسان ہے، کوئی مخلص بندہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برنیئر ہو یا اسلام کے متعلق مغرب کے مطالعہ کنندگان کا پورا جتھہ، محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کی تکذیب کرتا ہے۔ آنحضورؐ کے بلند وارفع مقام کے مقابلے میں تو اورنگ زیب ایک حقیر اُمتی ہے۔ برنیئے اور اس کے دوسرے دوست اس بے چارے کے ساتھ کیا انصاف کریں گے۔

اورنگ زیب کا اصل جرم

اورنگ زیب کا اصل جرم کچھ اور ہے، جس کے لئے ہر ڈھنگ کے سیکولر عناصر، خواہ وہ ہندو ہوں، مغربی مؤرخین ہوں یا نام نہاد مسلمان پاکستانی سیکولر، اُسے کبھی نہیں بخشیں گے۔ اس نے ہندو دلدل میں پھنسے مسلمانوں کا تشخص بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ ہندو تو خاص طور پر آتش زیر پا ہیں کہ اورنگ زیب نے اُن کی فتح کی اُمیدوں پر اس وقت پانی پھیر دیا کہ ''دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام'' رہ گئے تھے۔ عیسائی مؤرخ اس لیے آگ بگولا ہیں کہ تختِ دہلی پر عیسائیت کی حکمرانی کے خواب اس نے بکھیر کر رکھ دیے۔

اگر مسلمانوں پر اکبر اور داراشکوہ کی طرح کے چند اور حکمران حکومت کر لیتے تو صحیح تر الفاظ میں نہ

آج پاکستان نام کی کسی مملکت کا وجود ہوتا، نہ اسلام کی سربلندی یا سیکولرزم کی مخالفت کے نعرے گونج رہے ہوتے۔

ایک علامت کے طور پر ہمارے جذبات واحساسات پر اورنگ زیب کی گرفت بہت مضبوط ہے، کیونکہ اس نے مسلم شعور کو حیاتِ تازہ بخشی، ہماری لڑکھڑائی قومی شخصیت کو سہارا دیا اور خطرے کو بھانپنے کی ہماری سوچ کو بیداری اور توانائی بخشی۔ اس نے ہمیں یہ بھی سمجھا دیا کہ جب خونیں رشتے بھی اسلام کے خلاف صف آراء ہو جائیں تو ان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ عالمگیر کو آزاد روی پر مبنی کفر کی حقیقی فطرت کا بہ خوبی اندازہ تھا۔ یہ اُسی نے ہمیں سمجھا دیا کہ مذہبی معاملات میں بگ ٹٹ آزاد روی محض ایک نظریہ یا فلسفہ نہیں، یہ تو قوت اور اختیار کی ڈاکٹرائن (doctrine) ہے جو حکومت پر قبضے سے کم پر راضی نہیں ہوتی۔ یا تو آپ اسے سینگوں سے پکڑیں ورنہ یہ خود آپ کو اُدھیڑ کر ختم کر دے گی۔ بہ ایں ہمہ سیکولر اندازوں کے مطابق اورنگ زیب کو رگیدتے رہنا بہت ضروری ہے، ورنہ وہ اپنے کردار سے لوگوں کو بتاتا رہے گا کہ آج اس اکیسویں صدی میں بھی اصل مسئلہ کیا ہے۔

مزید براں اورنگ زیب محض بادشاہ نہ تھا، وہ ایک نجات دہندہ تھا، ایک دُور اندیش انسان تھا، جسے اپنا عظیم ومقدس کردار صاف نظر آ رہا تھا۔ اپنے عہد کے منظر نامے پر اس نے اپنا کردار کمال خوبی اور حوصلہ مندی سے ادا کیا۔ فی الواقع اس نے مسلمانوں کو شک، تذبذب اور خوف کی بے سکون کیفیت سے نکالا۔ انہیں یقین وایمان اور ولولۂ تازہ دیا، جس نے انہیں اپنی نظروں میں باوقار بنا دیا۔ آج چار صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس کے مخالفین کی زہریلی پھنکاریں ثابت کرتی ہیں کہ اپنے وقت کی نیام میں وہ اسلام کی بہترین تلوار تھی۔ اقبال نے کیا خوب کہا:

پایۂ اسلامیاں برتر ازوں
احترامِ شرع پیغمبرؐ ازوں

مسلمان ان کی کوششوں کے نتیجہ میں دنیا میں بہتر مقام پر ہیں۔ رسول اللہؐ کی شریعت کا احترام انھی کے رہینِ منت ہے۔

1 'Ali ibn al-Husayn al-Mas'udi, *Murruj al-Dhahab wa Mahadin al-Jauwahir*, section 989.

2 Dr. Muhammad *Iqbāl, Israār-i Khudi*.

3 Michel Foucault, *The Archeology of Knowledge*, trans. A.M. Sheridan Smith (New York: Harper Colphon, 1972, p. 7, cited by Herbert Dreyfus and Paul Rabinbow, *Beyond Structuralism and Hermeneutics* (Chicago: The University of Chicago Press, 1983) p. 51.

For an excellent exposition of Michel Foucault' thought, this is must read.

4 For the Archibald Constable's note, see François Bernier, *Travels in the Mogul Empire* 1656-1668 (New Delhi: Asian Educational Services, 2004) p. 7, fn 1

5 Bernier, *Travels* ... p. 291.

6 Ibid., p. 288

7 Ibid., p. 288, fn 1

8 Ibid., p. 291.

9 Ibid., p. 292.

10 Ibid., p. 291.

11 Ibid., p. 10.

12 Ibid., p. 10.

13 Ibid., p. 10.

14 Ibid., p. 11.

15 Ibid., for the quote from Catou, see fn 1, p. 11.

16 Sayyid Najīb Ashraf Nadvi, (ed)., *Ruq'āt 'Ālamagīr*, (Azamgarh: Dar al-Musannafin, 1927) ruqa' 1/197, p. 311. This is Jahān Āra's letter to Aurangzeb.

17 Jean Baptiste Tavernier, Travels in India, edited by William Crooke (Delhi: Low Price Publications, 2000) p. 274.

18 For Prof Charles Joret's comment from his biography of Tavernier, see Tavernier, *Travels* ..., p. xxvi, "introduction."

19 For H.A.Rose's comment, see p. xliv under "some additional notes on Tavernier's history and geography."

20 Ibid.

21 Ibid., ivii

22 Shāhjahān had great qualities of heart and mind. Also established is his great love for his children. But as Dārā's love began to absorb him, he lost his balance. Increasing age made him a different person. Gradually, he became suspicious of Aurangzeb's intentions. One time, Aurangzeb wounded his finger. Writing with a bandage finger was inconvenient but since he had to respond to his father's letter, he wrote it. When his father received his letter, the handwriting had an obvious slant. Shāhjahān flared up or probably Dārā Shikoh made him believe that instead of Aurangzeb writing himself, somebody else wrote it, which shows Aurangzeb's arrogance and insolence towards his father. See ruqa' 10/96, p. 171.

23 *Ruq'āt 'Alamgīr, ruqa'* 27/159. pp. 250-251.

24 Ibid.

25 About this event chronicled Mirzā Muhammad Kāzim Shirāzi, *'Ālam-gīrnāma* (Murādabād: Kutab Khāna Qāzi Taslim Husain), see Sayyid Miān Muhammad, *'Ulamā-i Hind kā shandār māzi* (Lahore: Maktaba Muhammadia Sāqi Must'ad Khān, Ma'āsir-i 'Ālamgīri (Lahore: Suhail Academy, 1981) p. 317.

26 Sāqi Must'ad Khān, *Ma'āsir-i 'Ālamgīri* (Lahore: Suhail Academy, 1981) p. 317.

27 For this quote from Ināyatullāh Khān, *Ahkām 'Ālamgīri*, see Sayyid Miān Muhammad, *'Ulamā-i Hind*...p. 455. Ināyatullāh Khān was Aurangzeb's secretary.

28 Aurangzeb considered fighting Dārā Shikoh as his obligation toward Muslims and Islam. "Since the power shift had already occurred during your Majesty's illness to the Prince, who had no Islamic imprint to his character and had begun consolidating to his advantage the military power, assuming all the trappings of kingship and spreading disbelief and atheism, it had become obligatory on me religiously, rationally, and even according to the usage, to face him. For this obligation, I made the move [towards Agra]. Before, I had to fight with the infidels, who were replacing masājid with idol-worshipping temples, followed with my charge against the secularists and atheists. As my intention was not soiled with selfishness, I succeeded in vanquishing them even with a small number of troops and my body remained free from injury." (translation mine). See Ruq'āt ... , *ruqa'* 7/130, , p. 223.

29 Bernier, *Travels* ..., p. 287, fn1. This is Archibald Constable's

footnote from Catou's *History*...

30 Darā's letter is preserved in *Ruq'āt 'Ālamgīr*; ruqa' 2/211, p. 330 and reads as follows: "To this humble person, intuitional responses [and ecstasies] that do not accord with Allah's commandments and His prophets' are far better than what is within the books ... I have given up their reading and devoted myself to the study of my heart, which is a limitless ocean...."

31 *Ruq'āt 'Alamgīr; ruqa'* 4/119 B., p. 204.

32 For this quote from Dārā, see Zahirruddin Fārūqi, *Aurangzeb and his Times* (Delhi: Idārāh Adhiyāt, 1972) p.50.

33 *Ruq'āt 'Ālamgīr*; ruqa' 4/119, pp. 198-205.

34 *Ruq'āt 'Ālamgīr* ..., ruqa' 8/235, p. 357

35 Aurangzeb's letter is self-explanatory: "The prince Dārā Shikoh has arrived in Dholpur. It is beyond his ability to win against a battle-tested commander like me. It will be prudent if he considers his elderly status and withholds his intention of warring against me and go to his dominion Punjab while giving me the chance to serve your Majesty for a few days." See ruqa '4/119-A, p. 200. (translation mine)

36 *Ruq'āt 'Ālamgīr*; ruqa' 6/121, p. 207.

37 *Ruq'āt 'Ālamgīr*; ruqa'3/ 198-B, p.300.

38 *Bernier, Travels* ..., p. 65.

39 *Ruq'āt 'Ālamgīr*; ruqa' 1/186, 295.

40 *Ruq'āt 'Ālamgīr*; ruqa' 1/186, 295.

41 *Ruq. 'āt 'Ālamgīr*; ruqa' 1/196., p. 309-310. The letter reads:

My Dārā Shikoh is about to reach Lahore. There is no shortage of money in Lahore while Kabul has no dearth of manpower and horses. It will be better if the brave commander reaches Lahore soon and while conjoining with Dārā punishes these two disobedient sons so that the imprisoned Sāhib-i Qur'ān get his freedom. (translation mine).

42 Bernier, *Travels* ... p. 65.

43 For this letter from Adab 367-a, see Zahiruddin Fārūqi, *Aurangzeb and His Times* (Delhi: Idārāh-i Adabiyāt, 1972) p. 65. I have made some changes in Faruki's translation.

44 Dr. Muhammad Iqbāl, *Isrār-i Khūdi*

45 *Ruq'āt 'Ālamgīr*, ruqa' 1/124, p. 212. See under the heading ba'd az 'uzlat-i Shāhjahān talāfi māfāt.

46 Ibid.

47 Bernier, *Travels*... p. 166.

48 Ibid.

49 *Ruq'āt 'Ālamgīr*, ruqa' 2/195, p. 308.

50 Bernier, *Travels* ..., p. 125. He willed for his father's release, as his death would take him out of the harm way from Shājahān

51 Bernier, *Travels* ..., p. 167

52 Ibid., pp. 167-168

53 Bernier, *Travels* ... p. 100. Khāfi Khan also suggests that Dārā had his execution "under a legal opinion of the lawyers, because he had apostatized from the law, had vilified religion and had allied himself with heresy and infidelity." For Khafi Khan's quote, see Bernier, p.100, fn 1. Before Dārā's death, Aurangzeb questioned his brother through someone. "What would you have done to the Emperor had he fallen into your hands as you have fallen into his?" "He is a rebel and a parricide," said Dārā, "let him judge of the treatment he has merited by reflecting upon his crimes and such deserts he would have received with the utmost rigour at my hands." p. 102, fn 1. If this dialogue is true, there was no forgiveness from Dārā's, either.

54 His books included *Safina al-Auliyā', Sakina al-Auliyā', Risāla Haq-numā, Hasanat al-Ar'āfin, Majma' al-Bahrayn, Maqalama Dārā Shikoh wa Baba Lal, Minhaj al-Sālakīn*. The last two were coauthored. In case of the *Maqalama*, the coauthor's name is Munshi Chander Bhan. For the list of these books, see Sayyid Muhammad Mian's *Ulamā-i Hind kā shandār māzī* (Lahore: Maktaba Mahmudiya, 1977) p. 302.

55 Two instances will be enough to show the close relationship they had developed. It is reported that when Aurangzeb was the governor of Multan, he would often visit Khawāja Ma'sūm. On such occasions, he had no special privileges. He would sit on the floor among the commoners like the rest. In this relationship, Aurangzeb was on the receiving end. Overawed by Ma'sūm's presence, he would not utter a word out of respect, sitting all the time with his

head slanted downward. If he had to ask anything, he would write it down for Ma'sūm to read.

When Ma'sūm started his journey for hajj, thousands of people thronged him on his route to Makkah. Aurangzeb was one of them. He presented him with 12,000 āshrafis, which Ma'sūm accepted contrary to his practice. He gave him the glad tiding of kingship in the near future. Aurangzeb asked him to write down the proclamation in his favour, which he did. Later, Aurangzeb younger sister Gauhar Āra would laughingly say that his brother bought this kingdom for the paltry sum of 12,000 āshrafis.

The other incident shows their closeness. Aurangzeb was then campaigning in Balkh. Young and determined, he could do even the impossible. Ma'sūm wants to harness his youth in the service of Islam. Ma'sūm's occasional letter is a masterpiece of rhetoric as well as rich in spirituality and persuasion. Urging him to restrain his youthful self and surrender himself to Allah for it is in surrender that a believer is exalted. He asks him, among others, to be firm in Islam:

"[I]t is obligatory for the one who is wise to reflect on the life spent so far and the goals he has opted for himself. He who attains this kind of wealth deserves to be congratulated; for him are all the applause. Let him have the glad tiding that he has found the justification for his birth and has qualified himself for Allah's mercy and beneficence. And if he has not succeeded so far, then he must continue his effort to realize it..." (translation mine).

56 For Constable's note see Bernier, *Travels* ... p. 101, fn 1.

57 Bernier, *Travels*...pp. 103.

58 Ibid.

59 *Ruq 'āt 'Alamgīr*, ruqa' 4/ 170, p. 264.

60 For Khāfi Khān's quote see Sayyid Muhammad Mian, *'Ulamā-i Hind* ... p. 521.

61 Bernier, *Travels* ..., pp. 27, 33.

62 *Ruq 'āt 'Ālamgīr*, ruqa' 4/ 170, p. 264.

63 Stanley Lane-Poole, *Mediaeval India under Muhammadan Rule* (Lahore: Sang-i Meel Publications, 2007) p. 351.

64 Iqbal, *Isrār*...